جنوری ۱۹۶۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

و قد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین ( )

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر سرپرستی

ن احسن اصلاحی

مدیر مسؤل

اسرار احمد

جلد ١٦	جنوری ١٩٦٩ء	عدد ١

تذکرہ و تبصرہ .... —— اسرار احمد - ١

انوار مجددی ★ تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب ... تلخیص و ترجمہ :

پروفیسر یوسف سلیم چشتی - ١٣

تدبر قرآن .... مولانا امین احسن اصلاحی

★ ایک ضروری تصحیح ١٦

★ دوسرے گروپ پر ایک اجمالی نظر ١٧

★ سورۂ الانعام کا عمود اور اس کے مطالب کا تجزیہ .. ... [illegible]

★ تفسیر سورۂ الانعام (١) ... ...

مطالعۂ حدیث ★ اسناد کی اہمیت ... ... مولانا عبدالغفار حسن ... ٤٩

مقالات ★ اسلامی ریاست میں جمہور کی حیثیت ... مولانا امین احسن اصلاحی ٥٣

★ صوفیائے متقدمین کا اجمالی تذکرہ (٣) ... پروفیسر یوسف سلیم چشتی ٦٩

یکے از مطبوعات

دارالاشاعت الاسلامیہ

کوثر روڈ ـ اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ـ 1 (فون—69522)

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اب سے ڈھائی تین ماہ قبل پاکستان کی سیاسی فضا میں جو زبردست طوفانی ہلچل پیدا ہوئی تھی، اس کا زور تو اگرچہ اب کم ہو گیا ہے اور دوبارہ کچھ ویسی ہی سکون آمیز کیفیت سیاسی میدان پر طاری ہو گئی ہے جیسی کسی بڑے طوفان بادو باراں کے بعد فضا پر طاری ہوتی ہے۔[۱] تاہم اس طوفان نے سیاسی میدان کے بہت سے گوشوں کو نکھار دیا ہے اور بہت سے زیر سطح رجحانات کو سطح پر لا کر نمایاں کر دیا ہے —— میثاق، اگرچہ ملکی سیاسیات سے بالعموم زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا، تاہم اس وقت جو صورتِ حال سامنے ہے اس سے بالکل صرفِ نظر بھی ممکن نہیں —— بنابریں ہم بعض مسائل و معاملات کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

میدان سیاست کی اس حالیہ سرگرمی کی ابتدا کچھ تو واقعتہً طوفانی انداز کی تھی اور کچھ اس بنا پر بہت زیادہ طوفانی محسوس ہوئی کہ ایک عرصے سے ہمارے ملک میں سیاست کے میدان پر قبرستان کی سی خاموشی طاری تھی —— ورنہ ظاہر ہے کہ ہر آزاد ملک میں کچھ نہ کچھ سیاسی سرگرمی تو ہر وقت ہی جاری رہتی ہے، جو انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں بھی کبھی کبھی طوفانی انداز اختیار کر لیتی ہے (جیسا کہ حال ہی میں فرانس میں ہوا تھا!) رہے درمیانی درجے کے ممالک تو ان میں تو اکثر و بیشتر سیاست چلتی ہی اس انداز پر ہے، مثلاً ہمارے ہمسایہ ملک ہندوستان میں سال بھر کے دوران شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو جب اس کے کسی نہ کسی حصے میں بالکل اسی طرح کی صورت حال موجود نہ رہتی ہو جیسی ہمارے یہاں اس طوفان کے ابتدائی دنوں میں تھی —— ہمارے یہاں چونکہ ایک طویل

---

[۱] اگرچہ کچھ نہیں کہا جا سکتا، عین ممکن ہے کہ یہ سکوت و سکون کسی دوسرے طوفان کا پیش خیمہ ہی ثابت ہو!

عرصے کے تعطل کے بعد سیاسی سرگرمی کا آغاز ہوا تھا۔ لہٰذا کچھ تو یہ فی نفسہٖ تیز و تند (RASH) تھی اور کچھ بھی اس کے لئے تیار نہ تھی۔ چنانچہ اس کی جانب سے صورت حال سے عہدہ برآ ہونے میں شدید غلطیاں ہوئیں۔ نتیجۃً مزید بگڑی اور کچھ ایسا سماں بندھا کہ ایک بار تو بالکل ایسے محسوس ہوا جیسے صدر ایوب کی حکومت خاتمے پر ہے پاکستان فوری طور پر کسی نئی سیاسی و انتظامی صورت حال سے دوچار ہونے والا ہے ——— لیکن رفتہ رفتہ صورت حال سنبھل گئی۔ چنانچہ ایک طرف کچھ تو ایجی ٹیشن کا زور مدھم پڑا اور کچھ حکام سنبھلے، اور دوسری طرف کچھ اپوزیشن کی اپنی صفوں کے بعض رخنے منظر عام پر آئے اور کچھ حکومت کی اعلیٰ ترین سطح کی جانب سے بھی سیاسی گفتگو پر آمادگی کا اظہار ہوا ——— نتیجۃً حالات و واقعات نے کسی فوری اور ہنگامی معاملے کی بجائے مسلسل اور مستقل سیاسی سرگرمی کی صورت اختیار کر لی ——— !!

ہمارے نزدیک سیاسی میدان کی یہ سرگرمی بجائے خود ملک و ملت کے حق میں ایک فالِ نیک ہے۔ قبرستان کی سی خاموشی یا جیل کا سا "سب اچھا!" حکمرانوں کے نقطۂ نظر سے چاہے کتنا ہی خوش آئند ہو۔ کسی آزاد ملک اور زندہ قوم کے حق میں زہر ہلاہل سے کسی طرح کم نہیں۔

ہمارے نزدیک عوام کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملکی و ملی مسائل سے بھرپور دلچسپی لیں اور اپنے بھلے اور برے کے بارے میں خود سوچیں۔ اپنے ملک کے انتظامی معاملات کا فیصلہ اور اپنی قومی پالیسیوں کے رُخ کا تعین عوام کا حق ہی نہیں فرض ہے ——— اور خاص طور پر پاکستان ایسے زیر تر قی ملک میں تو اس امر کی بھی شدید ضرورت ہے کہ عوام انتظامیہ پر نہ صرف یہ کہ کڑی نظر رکھیں بلکہ اسے پوری طرح لگام دے کر رکھیں ورنہ سیاسیات کے اس مشہور و معروف اصول کے مطابق کہ "اختیار و اقتدار میں بے راہ روی کا رجحان فطری طور پر موجود ہوتا ہے اور اقتدار مطلق تو لازماً بے راہ ہو کر رہتا ہے[1]!" ایک بے لگام اور بگٹٹ انتظامیہ کا بے راہ اور کج رو ہونا قطعی و یقینی ہے !!

فی ایام پاکستان کے ابتدائی دس سالوں میں ملکی سیاست کے بازار میں خاصی اداسی رہی تھی اور وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ "پاد لیمانی سیاست" کی گہما گہمی اور حالات کی تبدیلی اور واقعات و حوادث کی رفتار میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا تھا ——— اگرچہ مضبوط اور محکم سیاسی جماعتوں کے فقدان کے باعث میدان سیاست کی یہ ساری گرما گرمی خیر کے بجائے شر پیدا کرتی چلی گئی جس کا منطقی نتیجہ ۱۹۵۸ء کے فوجی انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔

---

[1] "Authority tends to corrupt; and absolute authority corrupts absolutely"

ہم نے مئی ۶۷ء میں ان ہی صفحات میں ۵۸ء کے اس فوجی انقلاب کی نوعیت، اس کے اسباب و علل اور عواقب و نتائج کے بارے میں جو رائے پیش کی تھی وہ حسبِ ذیل ہے :-

"میدانِ سیاست کے اس اختلال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر رفتہ رفتہ سرو سز کے جانب منتقل ہوتی چلی گئی تا آنکہ ۵۸ء میں صدر ایوب نے تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے کر فوجی حکومت قائم کر دی اور تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر ایک طرف حکومت کا پورا نظم و نسق کلیۃً سرو سز کے حوالے کر دیا اور دوسری طرف بنیادی جمہوریت کے نظام کے ذریعے سیاسی حقوق اور اختیارات کو تدریجاً عوام کے جانب منتقل کرنے کا وہی سلسلہ از سرِ نو شروع کیا جس پر تقریباً نصف صدی قبل غیر ملکی حکمران عمل پیرا ہوتے تھے —— گویا پاکستان کی عوامی سیاست ایک دم واپس نصف صدی قبل کے مقام پر پہنچ گئی !

ملی اور قومی نقطۂ نگاہ سے یہ صورتِ حال یقیناً نہایت تشویش ناک اور پریشان کن ہے اور ہر مخلص اور محبِّ وطن پاکستانی کو لازماً اس پر سخت مضطرب اور غمگین ہونا چاہیے۔ لیکن اس حقیقت کو ہر آن پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس کا اصل سبب قوم میں سیاسی شعور کی خطرناک حد تک کمی اور ملی و قومی احساسات کا خوفناک حد تک فقدان ہے! کسی ایک یا چند افراد کے سر اس پوری صورتِ حال کی ذمہ داری تھوپ دینا یا سیاسی بے بصیرتی کا شاہکار ہے یا علمی خیانت کا !"

بہر حال مارشل لا کے نافذ ہوتے ہی فطری طور پر ملکی سیاست کا بازار ایک دم سرد ہو گیا اور تمام سیاسی حلقے موت و زیست کی کشمکش سے دوچار ہو گئے۔

مارشل لا تو ہمارے ملک میں اگرچہ چند ہی سال جاری رہا اور چاہے کسی کو پاکستان کے موجودہ دستور سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، بہر حال یہ ایک واقعہ ہے کہ ۶۲ء سے ہمارے ملک میں ایک باقاعدہ دستوری حکومت قائم ہے —— لیکن بالکل ایسے جیسے حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد بھی ایک عرصے تک جنوں اور شیاطین پر ان کی ہیبت و دہشت کے اثرات قائم رہے تھے، ہمارے سیاستدانوں کو بھی مارشل لا کے صدمے سے ہوش میں آنے میں کافی وقت لگا —— اور مارشل لا کے خاتمے کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک ملکی سیاست کے میدان میں مکمل سرد بازاری کا سماں طاری رہا !

یہ واقعہ ہے کہ مارشل لا کے صدمے سے سب سے پہلے ہوش میں آنے والی جماعت 'جماعتِ اسلامی' تھی جو سیاسی جماعتوں پر سے پابندی اٹھ جانے کے فوراً بعد ایک منظم جماعت کی حیثیت سے برسرِ کار ہو گئی —— اور یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ اس کے کارکنوں نے مارشل لا کے دوران بھی کسی نہ کسی صورت میں اپنی اجتماعیت کو برقرار

دکھاتا تھا ــــــ دوسرے نمبر پر حرکت میں آنے والا گروپ نظامِ اسلام کا تھا ــــــ مسلم لیگ کے احیا کی کوشش ہوئی تو وہ فوراً سرکاری اور مخالفِ سرکار دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ رہے پاکستان کے اکثر قدیم، خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان تو ان کی اکثریت صورتِ حال کو کچھ زیادہ امید افزا نہ پاکر بدستور گوشۂ عافیت میں دبکی رہی۔

۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے موقع پر ۵۸ء کے بعد پہلی مرتبہ ملکی سیاست کے میدان میں کچھ ہلچل پیدا ہوئی۔ اور محترمہ فاطمہ جناح کی ہمت و جرأت نے دیمک کی طرح مارشل لاء کے عصائے سلیمانی کو چٹ کر لیا۔ تب سیاسی سورماؤں کو ہوش آیا اور وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ لیکن اب وقت کم تھا اور صدر ایوب کی سیاسی حکمتِ عملی نے انتخابات کو ملتوی کرنے سے انکار کر کے 'احزابِ مخالف' کے ہاتھوں سے موقع چھین لیا!

اس موقع پر مخالف احزاب نے ' C O P ' کے نام سے جو متحدہ محاذ قائم کیا تھا اس کے پاس عوام کو اپیل کرنے کے لئے تو آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کے قیام کا بھاری بھرکم نعرہ تھا۔ لیکن تجزیے سے جو بات سامنے آتی تھی وہ صرف یہ تھی کہ صدارتی طرزِ حکومت کے بجائے پارلیمانی طرز کا احیاء مطلوب تھا اور بس۔ اس مطالبے اور اس کے لئے متحدہ محاذوں کے قیام کے بارے میں ہماری پختہ رائے وہی ہے جو ہم نے مئی ۶۸ء کے متذکرہ بالا تذکرہ و تبصرہ میں حرفِ حق کی حیثیت سے لکھی یعنی یہ کہ :-

"ساتھ ہی یہ موٹی سی بات بھی ہر مخلص پاکستانی کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے کہ اس کا علاج نہ صدارتی اور پارلیمانی جمہوریت یا بلاواسطہ و بالواسطہ انتخابات کے مسئلوں پر وقتی ہنگامے اٹھانے سے ہو سکتا ہے نہ مینڈکوں کی پنسیری کی طرح کے بالکل انمل بے جوڑ متحدہ محاذوں کے قیام سے ـــــ! اس صورتِ حال کی اصلاح کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ بالکل فطری طریق پر عوام میں سے کوئی سیاسی جماعت ایسی اٹھے جو مسلسل محنت و مشقت اور پیہم جد و جہد کے ذریعے ایک طرف ان میں سیاسی شعور اور اپنے بھلے اور برے کی حقیقی پہچان پیدا کرے اور دوسری طرف ایک بڑی تعداد میں ایسے قومی کارکنوں کو تربیت دے کر تیار کرے جو ہر طرح کے مفادات سے صرفِ نظر کر کے خالص اصولوں کے لئے کام کر سکیں اور اپنے مقصد اور نصب العین کے ساتھ مخلصانہ تعلق اور قوم کی بہتری اور بھلائی کے لئے انتھک محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کی صلاحیت رکھتے ہوں ـــــ!"

۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کے چار سالوں کے بعض حالات و واقعات کا تذکرہ ملک کی موجودہ سیاسی صورتِ حال کے صحیح تجزیے اور ان مختلف عوامل کے صحیح فہم کے لیے ناگزیر ہے جو اس وقت ملک کی سیاسی فضا

ہیں برسر کار ہیں۔

۱۔ ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے دوران جو زلزلہ سا صدر ایوب کے ایوانِ اقتدار میں محترمہ فاطمہ جناح کی شرکت کے باعث آ گیا تھا، اس سے خبردار ہو کر صدر ایوب نے اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے اور اس غرض کے لئے اپنی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر از سرِ نو منظم کرنے کی جانب توجہ کی اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے لئے انہوں نے سر توڑ کوشش کی۔ چنانچہ ابتدائی زمانے میں جبکہ احزابِ اختلاف ابھی کچھ تو اپنی انتخابی شکست کے زخم چاٹنے میں مصروف تھیں اور کچھ باہم دست و گریباں بھی ہو گئیں تھی۔ کنونشن لیگ کی تنظیم نو کا خاصہ چرچا ہوا اور کچھ عرصے تک تو یہ محسوس کیا گیا کہ شاید آئندہ اس ملک کی واحد سیاسی تنظیم سرکاری لیگ ہی ہو گی ——— لیکن جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ نہ تو صدر ایوب عوام میں کوئی "جذبہ تازہ" پیدا کر سکے اور نہ ہی مخلص اور محنتی کارکنوں کی کوئی ٹیم تیار کر سکے ——— چنانچہ ادھر کچھ عرصے سے صدر ایوب کے قریبی حلقے کے لوگ بھی برملا اعتراف کر رہے ہیں اور غالباً حالیہ سیاسی ہنگاموں کے بعد تو صدر ایوب خود بھی محسوس کرتے ہوں گے کہ وہ پاکستان مسلم لیگ کو ایک منظم اور فعال عوامی جماعت بنانے کی کوشش میں قطعاً ناکام ہو گئے ہیں اور اس کوشش میں جو وقت اور سرمایہ صرف ہوا وہ اکثر و بیشتر ضائع ہو گیا ہے!

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں کسی عوامی جدوجہد کے دوران محنت و مشقت اور ایثار و قربانی کے ذریعے منظم و مستحکم ہوا کرتی ہیں اور مصائب و تکالیف کے الاؤ اور ابتلاؤں اور آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزر کر ہی ان کے کارکنوں کا مس خام کندن بنتا ہے؛ مسند اقتدار تک رسائی کے بعد سے تو فوری طور پر کسی سیاسی جماعت کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ حکومت کے ایوانوں اور اقتدار کی مسندوں پر بیٹھ کر سیاسی جماعتوں کی تنظیم کی کوشش ویسا ہی احمقانہ خیال ہے جیسا یہ منصوبہ کہ پہلے سیدھے یا ٹیڑھے جس راستے سے بھی ممکن ہو اقتدار پر قبضہ جما لیا جائے اور پھر اس کے ذریعے ایک عوامی اسلامی انقلاب برپا کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ کنونشن لیگ سے منسلک لوگوں میں سے اکثر و بیشتر کی اصل نظر مفادات پر ہے اور ان ہی کی باہمی بندر بانٹ پاکستان مسلم لیگ کی اصل اجتماعی سرگرمی ہے، نہ اس کے پاس مخلص کارکن ہیں اور نہ ہی عوام کی پشت پناہی اسے حاصل ہے ——— نتیجۃً صدر ایوب کی حکومت یا تو خود ان کی اپنی ذات کے بل پر قائم ہے یا سروسز کے سہارے، اس کی کوئی حقیقی اور واقعی سیاسی اساس موجود نہیں ہے۔

۲۔ ۱۹۶۵ء کی پاک ہند جنگ بلاشبہ گذشتہ صدارتی انتخابات کے بعد کے دور کا اہم ترین واقعہ ہے۔ ملک کے بقا و دفاع اور خاص طور پر اس کی خارجہ حکمت عملی کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے ہی، ملک

کی داخلی سیاست پر بھی اس کے بہت گہرے اثرات مترتب ہوئے۔ ہمیں یہاں اس سترہ روزہ جنگ کے اسباب و علل سے تو سرے سے کوئی بحث ہی نہیں، اس کے تمام عواقب و نتائج کا استقصاء بھی مطلوب نہیں، البتہ ان میں سے چند ایسے امور کا تذکرہ ناگزیر ہے جن کا براہ راست تعلق ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال سے ہے۔

● ان میں سے اہم ترین امر تو یہ ہے کہ اس جنگ کے جو نتائج برآمد ہوئے ان کی بنا پر صدر ایوب کی سیاسی حیثیت کو شدید دھکا لگا۔ اور ان کا جو ستارہ ایشیا کے ایک عظیم رہنما یا بالفاظ دیگر ایشیائی ڈیگال کی حیثیت میں عروج کی جانب حرکت کر رہا تھا مائل بہ زوال ہو گیا۔

● دوسرے یہ کہ پاکستان کی خارجہ حکمت عملی جو چند سال قبل سے مسلسل ایک خاص رخ پر بڑھتی چلی جا رہی تھی ایک انتہا پر پہنچ کر نہ صرف یہ کہ رک گئی بلکہ واپس قدیم سمت میں گردش کرنے لگی ——— اور یہ ظاہر احوال بھی اس میں کم از کم اعتدال کا رنگ نمایاں ہو گیا۔

● تیسرے یہ کہ مسلم قومیت کا جو جذبہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کا سبب بنا تھا لیکن قیام پاکستان کے بعد جلد ہی سرد پڑ گیا تھا۔ اس جنگ کے دوران نہ صرف یہ کہ ایک دم پھر بیدار ہوا بلکہ ایک بار پھر اپنے پورے عروج کو پہنچ گیا اگرچہ اس کا یہ زور ستور (TEMPO) اب کی بار بھی عارضی ہی ثابت ہوا۔ اور جنگ کے بعد جلد ہی یہ جذبہ پھر سرد پڑنا شروع ہو گیا۔

> پاکستان کی خارجہ حکمت عملی اور پاکستانی قومیت دونوں کے اعتبار سے پاکستان کی سیاسیات میں جو مدّ اس جنگ کے دوران آیا تھا، صدر ایوب کو تو اپنی مخصوص ذمہ دارانہ حیثیت کی مجبوریوں کی بنا پر اسے ایک خاص حد تک لے جانے کے بعد واپس جذر کی جانب لوٹنا پڑا ——— لیکن ان کے ایک اپنے تربیت دادہ نوجوان ساتھی نے مدّ سے جذر کی جانب رجوع سے انکار کر دیا اور وہ اسی مقام پر کھڑا رہ گیا۔ نتیجتہً اس نے اس مدّ کے لئے علامتی حیثیت اختیار کر لی ——— بس یہیں سے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی اصل ذاتی سیاسی زندگی اور پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ایک بالکل نئے باب کا آغاز ہو گیا !!

۳۔ قدیم سکہ بند احزاب اختلاف، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، ۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے بعد کچھ عرصہ تو کچھ اپنی انتخابی شکست کے زخموں کو سہلانے میں مصروف رہیں اور کچھ باہمی اختلافات میں الجھی رہیں۔ اس کے فوراً بعد ۶۵ء کی پاک ہند جنگ واقع ہو گئی جس میں پوری قوم متحد اور یکسو تھی اور اختلاف و افتراق کی گنجائش ہی نہ تھی۔ جنگ کے فوراً بعد اعلان تاشقند سے انہیں صدر ایوب کی حکومت کے خلاف عوامی جذبات کو مشتعل کرنے

کا ایک سنہری موقع ہاتھ آیا تھا اور مخالف جماعتوں کے جو قبیلے کارکن اس پر مصر بھی تھے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن بعض بزرگ سیاست دانوں، نے عوامی ایجی ٹیشن کی تجویز کو رد کر کے ایک پُر امن آئینی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا جس کے نتیجے میں جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی، عوامی لیگ اور مشرقی پاکستان کے قومی جمہوری محاذ پر مشتمل ایک متحدہ محاذ پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (PDM) کے نام سے معرض وجود میں آگیا۔ جو تقریباً دو سال سے سہل انداز میں اور سبھ چال سے لیکن بڑے تسلسل و استقلال کے ساتھ دھیمے دھیمے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک مسٹر بھٹو نے ہنگامہ کھڑا کر کے اسے بالکل نئی صورت حال سے دوچار کر دیا۔

پی ڈی ایم کو اس بات کا کریڈٹ بہر حال دیا جانا چاہیئے کہ اس نے تقریباً دو سال تک بحالی جمہوریت کے لیے بڑی مستقل مزاجی سے کام کیا ہے اور اس کے لیے واقعی اور حقیقی محنت کی ہے۔ اور اگرچہ وہ جس شائستہ (SOPHISTICATED) قسم کے طریق کار کی عادی ہے۔ اس سے کسی بھی حکومت کو فوری طور پر خائف ہونے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کجا کہ ایک ملک کی اپنی نوکر شاہی (BEUROCRACY) کی حکومت کو جو ایک حقیقی عوامی جمہوری حکومت کے سوائے باقی تمام قسم کی حکومتوں سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے ——— تاہم اس میں شک نہیں کہ کم از کم پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پی ڈی ایم کی حالیہ دو سالہ جد و جہد ایسی منظم اور مسلسل اور آئینی و پُر امن جد و جہد کی کوئی دوسری مثال جماعت اسلامی کی ابتدائی دستوری مہموں کے سوا نہیں ملتی ———

اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ PDM کا اصل تنظیمی ڈھانچہ بھی جماعت اسلامی ہی کے سہارے قائم ہے اور اس کی اصل روح رواں بھی جماعت اسلامی ہی ہے۔ پی ڈی ایم میں شامل دوسری تمام جماعتیں پارٹیاں چند معروف سیاست دانوں کی باہمی ایسوسی ایشنوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ وہ اصل جماعتی تنظیم کے بل پر پی ڈی ایم کا سارا کاروبار چل رہا ہے صرف جماعت اسلامی کی ہے۔

پی ڈی ایم کے بارے میں ایک اور اہم بات جو پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ اس پر دائیں بازو کے رجحانات کا فیصلہ کن غلبہ ہے۔ بائیں رجحانات کے حامل صرف نہایت نرم طبع اور معتدل مزاج لوگ ہی اس میں کھپ سکے ہیں اور انہیں بھی جلد یا بدیر اس سے علیحدگی اختیار کرنی ہوگی ——— یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس اعتبار سے بھی اصل علامتی حیثیت اس گروہ میں جماعت اسلامی ہی کو حاصل ہے۔ اور یہ، جیسا کہ ہم بعد میں قدرے تفصیل سے عرض کریں گے، اس ملک میں اسلام کے مستقبل کے اعتبار سے ایک بہت بڑی بدقسمتی کا آغاز ہے۔

۴۔ سوشلسٹ ذہن اور بائیں بازو کے رجحانات مشرقی پاکستان کی حد تک تو کم از کم اتنے ہی قدیم، بلکہ جتنا

خود پاکستان، لیکن مغربی پاکستان میں یہ رجحانات زیادہ تر ۶۵ء کی جنگ کے بعد ابھرے ہیں۔ اور گذشتہ دو ڈھائی سال کے عرصے میں، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رجحانات تیزی کے ساتھ پھیلے بھی ہیں اور مختلف تنظیمی ہیئتوں کی شکل میں نمودار بھی ہوئے ہیں۔ اس کا ایک سبب ملک کی معیشت میں (صنعتی انقلاب) کے اثرات بھی ہیں، جن سے موجودہ استحصالی نظام معیشت کی گھناؤنی صورت کھل کر سامنے آرہی ہے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بڑھتی ہوئی بیکاری سے بھی ان رجحانات کو تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے علاوہ ہماری گذشتہ پانچ چھ سال کی خارجہ پالیسی نے بھی جس کے مدّ و جذر کے جانب ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں ان رجحانات کو تقویت دی ہے ——— غرض کہ مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر ہمارے ملک میں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی قوت کی صورت اختیار کر لی ہے۔

مشرقی پاکستان میں مولانا بھاشانی اس کی ایک عظیم علامت ہیں اور مغربی پاکستان میں یوں تو اس کے کئی ایک دھڑے ہیں لیکن ان کے اصل علامت کی حیثیت بلاشبہ مسٹر بھٹو کو حاصل ہو گئی ہے۔ اور اگرچہ ان دونوں کے مابین اشتراکِ عمل کی کوئی واضح صورت تاحال سامنے نہیں آئی، تاہم یہ ایک یقینی امر ہے کہ عنقریب ان دونوں میں اتحاد کی صورت پیدا ہو جائے گی اور پھر یہ بائیں بازو کا وہ اصل مرکز (NUCLEUS) ہوگا جس کے گرد ملک کے تمام سوشلسٹ عناصر حتیٰ کہ معتدل مزاج (یا عام اخباری اصطلاح کے مطابق ماسکو نواز) طبقے بھی جو اس وقت پی ڈی ایم کے ساتھ ہیں جلد یا بدیر جمع ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

۵۔ گذشتہ دو ڈھائی سال کے دوران تدریجاً ایک اور قوت بھی پاکستانی سیاست کے منظر عام پر نمودار ہوئی ہے ہماری مراد جمعیت علمائے اسلام سے ہے جس نے اس عرصے میں رفتہ رفتہ خاصی قوت بہم پہنچائی ہے اور اپنے منتشر اثرات کو خاصے مضبوط تنظیمی سلسلے میں منسلک کر لیا ہے۔ یہ تنظیم اگرچہ اپنی ہیئت اور نوعیت کے اعتبار سے دوسری تنظیموں مثلاً جماعت اسلامی سے بہت مختلف انداز کی ہے (مثلاً اس کے یہاں کاغذی کارروائی اور دفتری نظام شاید بالکل ہی دقیانوسی اور PRIMITIVE طرز کا ہو) لیکن ایک مشترک ذہنی ساخت اور مشترک انداز فکر اور اس کے ساتھ ساتھ ایک شاندار ماضی کے ورثے کی بنا پر اس گروہ نے بہت جلد ایک نہایت منظم اور فعّال فطری تنظیم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ عوام میں اس کی جڑیں انتہائی زیریں سطحوں (SUBSTRATA) تک گہری اتری ہوئی ہیں۔ دینی مدارس اس کے مستقل مراکز اور اللہ کے گھر اس کے مستقل دفاتر ہیں۔ اس کے عام کارکن ہی نہیں اکابر تک سب خالص عوامی کارکن ہیں، سادگی، دینداری اور غایت درجہ خلوص کے ساتھ نہایت زوردار جذبۂ عمل اس کے شعائر ہیں۔ ان

تمام چیزوں کے پیش نظر یہ اندازہ قطعاً مبالغہ پر مبنی نہیں ہے کہ آئندہ پاکستان کی سیاست کے میدان میں جمعیت علمائے اسلام نہایت مؤثر رول ادا کرے گی۔

ہم اپنی صفحات میں چند ماہ قبل یہ عرض کر چکے ہیں کہ یہ گروہ ذہناً و قلباً خالص حسینیؓ ہے۔ یعنی علمائے دیوبند کے اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جس کے سرگروہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ تھے۔ اس طرح ان کا تعلق تحریک آزادیٔ ہند و استخلاص وطن کے اس قدیم و عظیم سلسلے سے جا ملتا ہے جو تحریک شہیدینؒ سے شروع ہو کر ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی سے ہوتا ہوا، اور پھر تحریک خلافت اور ریشمی رومالوں کی تحریک ایسی دوسری متعدد چھوٹی چھوٹی کڑیوں سے گزر کر بالآخر جمعیت علمائے ہند پر ختم ہوا تھا۔ اور اس پورے عرصے میں اسلامیان ہند کی رہنمائی کا فرض ادا کرتا رہا تھا۔ آزادیٔ ہند سے متصلاً قبل مسلمانان ہند کی ایک عظیم اکثریت نے اس گروہ کے راستے کو چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا تھا جو بالآخر قیام پاکستان پر منتج ہوا[1]۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اوّل اوّل اس طبقے پر شکست کا سا احساس طاری رہا۔ اور ان حضرات نے ایک عرصے تک حلقۂ دیوبند کے ان دوسرے اکابر کی سیادت قبول کر کے جنہوں نے تحریک پاکستان کا ساتھ دیا تھا گوشۂ عافیت میں پناہ لئے رکھی ۵۲/۵۳ء میں مجلس احرار اسلام نے جو عظیم سیاسی ایجی ٹیشن برپا کیا تھا اس کی پشت پر اصل قوت اسی گروہ کی تھی۔ اس کے فوراً بعد جب پاکستانی سیاست میں انتشار برپا ہوا اور مسلم لیگ کو فیصلہ کن سیاسی حیثیت حاصل نہ رہی تو اس گروہ نے بھی اپنی حامیٔ مسلم لیگ قیادت کا جوا گردن سے اتار پھینکا اور خالصتہً اپنا اصل اور قدیم رنگ اختیار کر لیا۔

——— اس وقت سے اب تک اندر ہی اندر ان کی تنظیم وسعت اختیار کرتی رہی اور اس کے کارکنوں میں جوش و جذبہ بیدار ہوتا رہا ——— گذشتہ سال ان کی جو کانفرنس لاہور میں موچی دروازے کے باہر ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ ہو گیا تھا کہ جلد ہی جمعیت پاکستان کی عملی سیاست میں مؤثر طور پر دخیل ہو گی ——— اور واقعہ بھی یہی ہے کہ مارشل لاء کے بعد سے جو سکوت و سکون پاکستانی سیاست پر طاری تھا اور لوگ جس طرح سہمے سہمے سے تھے اس میں پہلی ہلچل اور اوّلیں سیاسی سرگرمی جمعیت ہی کے زیر اثر پیدا ہوئی۔ ہماری مراد اس کامیاب ایجی ٹیشن سے ہے جو ڈاکٹر فضل الرحمان کی کتاب کے خلاف برپا ہوئی تھی اور جس سے چھٹکارا پانے کے لئے حکومت وقت کو ڈاکٹر صاحب موصوف کو قربانی کا بکرا بنانا پڑا تھا!

اس گروہ کے بارے میں اہم ترین بات جو نوٹ کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا رجحان بایں بازو کی جانب ہے اور چاہے اس کا سبب مغربی استعمار سے شدید نفرت کا وہ قدیم جذبہ ہو جو انہیں اپنے

---

[1] اس اہم موضوع پر ہم مفصل اظہار خیال مارچ ۱۹۶۷ء کے تذکرہ و تبصرہ میں کر چکے ہیں۔

اسلاف سے ورثے میں ملا ہے اور گویا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے، چاہے یہ واقعہ ہو کہ چونکہ یہ خود ایک خالص عوامی قوت ہیں لہذا عوام کی دقتوں اور مشکلات کا زیادہ قریبی احساس رکھتے ہیں، اور چاہے یہ ہو کہ ماضی میں ان کا اشتراک عمل جس عظیم سیاسی تحریک کے ساتھ رہا ہے (ہماری مراد ماضی کی انڈین نیشنل کانگرس سے ہے!) اس پر بالعموم سوشلسٹ خیالات کا غلبہ تھا ——— سبب یا اسباب خواہ کچھ بھی ہوں بہرحال واقعہ یہی ہے کہ جمعیت علمائے اسلام کا رجحان بائیں بازو کی جانب ہے۔ اور چاہے اس کے اکابر و رہنما خالص اور بے آمیز شش اسلام ہی کے علمبردار ہوں۔ اس کے کارکنوں میں کثیر تعداد ایسے جوشیلے لوگوں کی شامل ہے جو اسلام کے ساتھ سوشلزم کا پیوند نظری طور پر درست اور بحالات موجودہ عملاً لازمی خیال کرتے ہیں ——— !

یہی وجہ ہے کہ شرق اوسط کی سیاست میں بھی یہ حضرات صدر ناصر کے حامی و موید اور شاہ فیصل کے ناقد و مخالف ہیں ——— اور تازہ سیاسی ہنگامے میں بھی ان کی شرکت اولاً نیشنل عوامی پارٹی اور بھٹو صاحب کی پاکستان پیپلز پارٹی کے شانہ بشانہ ہوئی ہے۔ اس صورت حال کا صحیح اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگلستان سے واپسی پر جب مولانا مودودی نے بغیر معمولی گھن گرج کے ساتھ سوشلزم کے حامیوں کو چیلنج کیا تو اس کے جواب میں جمعیت علمائے اسلام کے سرکاری آرگن ترجمان اسلام نے "مودودی صاحب کی تازہ گھن گرج" کے عنوان سے تحریر فرمایا کہ :-

"لندن کی سرد آب و ہوا سے صحت یاب ہو کر مودودی صاحب پاکستان کے نسبتاً گرم ماحول میں تشریف لا چکے ہیں جس کی گرمی میں کافی اضافہ ان کی غیر حاضری کے دوران کے پیدا شدہ گرم سیاسی موسم نے کر رکھا ہے آپ نے ۳۰ دسمبر کی شام کو لاہور میں مختلف حصوں سے آئے ہوئے اپنی جماعت کے کارکنوں سے زبردست گھن گرج کے عالم میں فرمایا کہ " جب تک ہم زندہ ہیں اس وقت تک کسی کی یہ ہمت نہیں ہے کہ یہاں اسلام کے سوا کسی اور نظام کو لا سکے"۔ مودودی صاحب کی یہ گھن گرج اگر اس دعویٰ کی حقیقتاً حامل ہوتی اور اپنے ان فرمودات کے دوسرے حصوں میں خود ہی انہوں نے اپنی اس گھن گرج" کی بالمعنی تردید نہ فرما دی ہوتی تو اس اعلان کا خیر مقدم پاکستان کا ہر دین دار مسلمان تہ دل سے کرتا۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ اس ساری "گھن گرج" کا مقصد صرف یہاں پہنچ کر ختم کر دیا گیا کہ " اسلام اور سوشلزم کا پیوند لگانا ممکن نہیں" اور یہ کہ " یہ محمد عربیؐ کی امت کا ملک ہے، یہ مارکس یا ماؤزے تنگ کی امت کا ملک نہیں ہے" ——— سوال یہ ہے کہ اسلام اور سوشلزم کے پیوند کا انکار کرنے والا اسلام اور برطانوی پارلیمانی نظام کے پیوند کا بھی انکار کیوں نہیں کرتا؟ اور محمد عربیؐ کی امت کے اس ملک کے مارکس اور ماؤزے تنگ کی امت کا ملک ہونے کی نفی کرنے والا اس ملک میں اس برطانوی سیاسی نظام کی بحالی کی جدوجہد میں کیوں مصروف ہے؟ جو گلیڈسٹون، لائڈ جارج، چرچل وغیرہ کا تراشیدہ اور رائج کردہ ہے؟ آخر

اسلامی نظام کے قیام کی یہ بلند بانگ صدا صرف سوشلزم کے ہی مقابلہ میں کیوں اتنی "گھن گرج" دکھاتی ہے اور کیوں برطانوی پارلیمانی نظام کی حمایت میں تبدیل ہوتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس نظام کے ہر چھوٹے بڑے جزو کو بھی قبول کرتی چلی جاتی ہے۔" (ترجمان اسلام ۱۰ جنوری ۷۹ء)

الغرض ایک مدتِ طویل کے حبس کے بعد جو طوفانی کیفیت گذشتہ ڈھائی تین ماہ کے دوران پاکستانی سیاست کے میدان پر طاری رہی تھی، اس کے مدھم پڑنے ہی جو نئی صورت حال سامنے آئی ہے اور گذشتہ چند سالوں سے جو رجحانات زیرِ سطح تقویت پاتے رہے ہیں ان کے ایک دم سطح پر آ جانے سے سیاست کی جو تازہ بساط پاکستان میں بچھی ہے، اس کا مختصر نقشہ یہ ہے:-

۱۔ جہاں تک حکومتِ وقت کا تعلق ہے، وہ کچھ ایک فرد کی ذاتی شخصیت کے سہارے اور زیادہ تر نوکر شاہی کے بل پر قائم ہے۔ اس کی عوامی و سیاسی جڑیں اوّل تو کوئی ہیں ہی نہیں، اور جو ہیں ان کی حیثیت بھی زیادہ سے زیادہ ان اضافی جڑوں (ADVENTITIOUS ROOTS) کی سی ہے جو بعض درختوں (مثلاً برگد) کی شاخوں سے اتر کر زمین میں پنجے گاڑ لیتی ہیں اور درخت کے پھیلاؤ کے لئے اضافی سہاروں کا کام دیتی ہیں۔

۲۔ پاکستانی سیاست کا وہ دور اب گذر چکا جب سیاست صرف اصحابِ دولت و ثروت کے مشغلے کی حیثیت رکھتی تھی اور گنتی کے چند جاگیردار اور سرمایہ دار (جن میں تازہ اضافہ بعض نودولتیے صنعت کاروں کا ہوا تھا) اس پر کامل اجارہ داری رکھتے تھے۔ اب یہاں عوامی سیاست کے دور کا آغاز ہو گیا ہے اور وہ دور قریب آیا چاہتا ہے جس کی خبر علامہ اقبال مرحوم نے اپنے ان اشعار میں دی تھی کہ ؎

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور ؎ گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشہ دکھا کر مداری گیا

۳۔ پاکستان کی موجودہ بساطِ سیاست کے عناصرِ اربعہ حسبِ ذیل ہیں: ایک دائیں بازو کے قدیم خاندانی اور پیشہ ور سیاست دان جو اکثر و بیشتر زمینداروں اور سرمایہ داروں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اگرچہ اس وقت متعدد سرکاری و غیر سرکاری لیگوں میں منقسم ہیں لیکن درحقیقت "ملّت واحدہ" ہیں اور کسی بھی وقت ع "آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک" کے مصداق باہم متحد ہو سکتے ہیں[1] —— دوسرے دائیں بازو کی مضبوط مذہبی جماعت — "جماعتِ اسلامی" —— تیسرے

---

[1] کنونشن لیگ اور کونسل لیگ تو خالص ہم جنس ہیں ہی۔ عوامی لیگ میں البتہ لیگی الاصل عناصر کے ساتھ ساتھ بعض حقیقی عوامی عناصر بھی شامل ہیں لیکن سیاست کی موجودہ تیز رفتاری کے پیشِ نظر ان کا جلد ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانا قطعی ہے

بائیں بازو کی سیاسی جماعتیں جن میں سے کچھ فی الوقت پی ڈی ایم (یا تازہ تر ڈی۔ اے۔ سی) میں شامل ہیں اور کچھ اس کے باہر ہیں۔ اور ـــــ چوتھے بائیں بازو کی مذہبی جماعت ـــــ جمعیت علمائے اسلام[۵]

۴۔ پاکستان کی آئندہ سیاسیات کا اصل محور (AXIS) دائیں اور بائیں بازوؤں کے رجحانات کا تصادم ہوگا[۶] اور متذکرہ بالا موجودہ لبساط سیاست میں جو گروہ بندیاں اس محور کے علاوہ کسی اور بنیاد پر قائم ہیں یا ابھی قائم ہو رہی ہیں وہ جلد یا بدیر ٹوٹ کر رہیں گی اور نئی صف بندی (ALIGHNMENT) اسی محور کے گرد ہوگی۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ قابل حذر لیکن غالباً یقینی امر یہ ہے کہ دائیں اور بائیں بازو کی بیرونی قوتیں بھی اب پاکستانی سیاست میں پہلے سے کہیں زیادہ دخیل ہوں گی اور اپنے اپنے مفادات کے تحفظ اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر کے دفاع اور ان میں توسیع کے لئے زیادہ سے زیادہ اس کی حد تک اثر انداز ہونے کی کوشش کریں گی

۵۔ ہمارے نزدیک اس وقت ملک کی داخلی سیاست کے اصل بنیادی مسائل دو ہیں: ایک یہ کہ سیاسی اختیارات ـــــ جو مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر عوام کے بجائے نوکر شاہی کے قبضے میں چلے گئے ہیں۔ وہ اختیار و اقتدار کے اصل مالکوں یعنی جمہور کو منتقل کئے جائیں اور دوسرے یہ کہ دولت اور خصوصاً ذرائع پیداوار جو عوام الناس کے بجائے ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری بن گئے ہیں انہیں پوری قوم میں عدل و انصاف کے ساتھ تقسیم کیا جائے ـــــ گویا کہ پہلی "انقلابی" جمہور کے نظام کے واقعی اور حقیقی نفاذ کی کوشش ہے اور دوسری "دور سرمایہ داری" کے منحوس اثرات اور نقوش کہن کو مٹانے کی سعی و جہد ہے۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی کوششیں درست بھی ہیں اور مبارک بھی! اور ملک کے ہر ذی شعور شہری کا فرض ہے کہ وہ ان میں اپنی اپنی صلاحیت، استعداد اور قوت کار کے مطابق حصہ لے۔ اسلام کے نزدیک یہ دونوں ہی مقاصد محمود ہیں۔ اسلام ایک طرف اسے بھی گوارا نہیں کرتا کہ بندگان خدا کی گردنوں پر کوئی ایک فرد یا کچھ افراد یا کوئی مخصوص طبقہ خدائی کا تخت جما کر بیٹھ جائے ـــــ اور دوسری طرف عدل و انصاف پر بھی انتہائی

---

[۵] رہے بعض وہ "تازہ واردانِ" بساط سیاست جو آزاد سیاست دانوں کی حیثیت سے دنگل میں شریک ہوئے ہیں تو اس سے قطع نظر کہ ہمارے نزدیک ان حضرات کی کوئی واقعی سیاسی اہمیت نہیں ہے اور ان میں سے بعض کا جو شاندار استقبال ہوا ہے وہ بھی ہمارے نزدیک پاکستانی قوم کے ایک طبقہ کے سیاسی افلاس کا مظہر ہے چونکہ وہ تقریباً سب کے سب دائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ہم انہیں میدان سیاست کا پانچواں سوار بھی تسلیم نہیں کرتے! بلکہ متذکرہ بالا صدر عناصر اربعہ میں سے پہلے عنصر ہی کا ضمیمہ سمجھتے ہیں!

[۶] جس کی ایک ناخوشگوار ابتداء لاہور اور کراچی میں دائیں بازو کی انتہائی جماعت یعنی جماعت اسلامی اور بائیں بازو کے انتہا پسند لوگ یعنی پی پی پی کے کارکنوں کے سر پھٹول کی شکل میں ہو چکی ہے۔

زور دیتا ہے۔ چنانچہ "وَ اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ"[1] آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض منصبی میں سے ہے اور لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ[2] کتاب الٰہی کا مقصد نزول ہے اور "دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ[3] کی کوئی صورت اسلام کے نزدیک کسی طرح بھی پسندیدہ نہیں!

لیکن افسوس کہ ہمارے یہاں اس وقت ان دونوں ہی میں شدید افراط و تفریط سے کام لیا جا رہا ہے۔ دایئں بازو کے اہل سیاست نے صرف پہلے کام پر نگاہوں کو مرکوز کر دیا ہے اور دوسرے معاملے کے ضمن میں وہ "وعدۂ فردا" سے آگے قدم بڑھانے کو تیار نہیں، اور مزید بدقسمتی یہ کہ "سلطانیٔ جمہور" کے ذیل میں بھی ان کے سارے تصورات یورپ کے معنی بالحاد فکر سے مستعار لئے ہوئے ہیں ——— دوسری طرف بایئں بازو کے حامی لوگوں نے اپنی اصل توجہ دوسرے کام پر مرکوز کر دی ہے اور 'عدل اجتماعی' کے لیے نظام بھی ان کے پیش نظر خدا تعالیٰ اور رسولؐ کا عطا کردہ نہیں، مارکس، لینن اور ماؤزے تنگ کا وضع کردہ ہے ———!!

ایسے صورت حال میں ہر اس شخص کے لئے جو اوّل و آخر صرف مسلمان ہو اور جس کے نزدیک دین و مذہب ہر چیز پر مقدم ہوں ایک اہم لمحہ فکریہ ہے ——— ایسے سب لوگوں کو، خواہ وہ موجودہ سیاسی سرگرمی میں کسی حیثیت سے شریک ہوں، خواہ کسی خالص غیر سیاسی کام میں مصروف ہوں، اس صورت حال کا بنظر غائر مطالعہ کرنا چاہیئے اور آئندہ پیش آنے والے حالات کے مدّ نظر دین کے احیاء اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے مناسب لائحہ عمل طے کر کے اس پر عمل پیرا ہو جانا چاہیئے ہے

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!

(جاری)

---

[1] سورۂ شوریٰ۔ رکوع ۱۔ ترجمہ: "اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے مابین انصاف کروں!"

[2] سورۂ حدید۔ رکوع ۳، " : "تاکہ لوگ عدل و انصاف کے نظام پر قائم رہیں!"

[3] سورۂ حشر۔ رکوع ۱، " : "(سرمائے) کا الٹ پھیر اہل ثروت ہی کے مابین!"

(۲)

زیر نظر شمارہ بہت تاخیر سے شائع ہو رہا ہے جس کے لئے ہم قارئین سے معذرت خواہ ہیں اس کے اسباب میں سے اوّلین تو رمضان المبارک کی مبارک مصروفیت تھی۔ بعد میں کچھ اور عوامل کی بنا پر جن میں سے ایک 'میثاق' کے مینیجر صاحب کی علالت بھی ہے تاخیر بڑھتی چلی گئی۔ دوسرا شمارہ بھی اب غالباً نذر سے تاخیر سے ہی شائع ہو سکے گا۔ البتہ مارچ کا شمارہ انشاء اللہ بالکل بروقت شائع ہو جائے گا۔

انوارِ مجددی
تلخیص و ترجمہ: پروفیسر یوسف سلیم چشتی

تزکیہ نفس و تصفیہ قلب

(ماخوذ از مکتوب ۴۶، دفتر اوّل بنام شیخ فرید بخاریؒ)

واضح ہو کہ اللہ تعالےٰ کا وجود، اس کی توحید، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور جو کچھ آپؐ اللہ تعالےٰ کی طرف سے لے کر آئے ہیں یہ سب امورِ بدیہی ہیں یعنی کسی غور و فکر یا دلیل کے محتاج نہیں ہیں، بشرطیکہ انسان کی قوتِ مدرکہ (عقل و ذہانت) مریض یا سقیم نہ ہو، یعنی اگر اس کی عقل، روحانی امراض سے پاک ہے تو اسے کسی دلیل کی حاجت نہیں ہے۔ ان امور میں فکر و نظر کی ضرورت اس وقت تک ہے جب تک قلب مریض ہے۔ اگر قلب کی سلامتی حاصل ہو جائے یعنی اگر پردے اٹھ جائیں تو پھر کسی دلیل کی حاجت نہیں ہوگی۔ مثلاً جب تک ایک شخص امراضِ صفراوی میں مبتلا ہے، قند کی مٹھاس اس کے لیے محتاج دلیل ہے لیکن جس وقت اسے ان امراض سے نجات حاصل ہو جائے گی، وہ کسی سے قند کی مٹھاس کے لیے دلیل طلب نہیں کرے گا، چکھتے ہی بتا دے گا کہ قند میٹھا ہوتا ہے۔ یہی حال بھینگے آدمی کا ہے کہ وہ ایک کو دو دیکھتا ہے۔

یہ بات ثابت ہے کہ استدلال کا میدان بہت تنگ ہے اور دلائل کے ذریعے سے یقین کا حاصل ہونا بہت دشوار ہے۔ پس ایمانِ یقین کے حصول کے لیے امراضِ قلبی کا ازالہ کرنا بہت ضروری ہے۔ صفرا کا مریض اگر قند و نبات کی شیرینی کا یقین حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے مناسب طریق کار یہ ہے کہ وہ قند کی مٹھاس پر دلیل طلب کرنے کے بجائے اپنے مرض کو دور کرے، جب صفرا دور ہو جائے گا تو شیرینی کا یقین خود بخود حاصل ہو جائے گا یعنی وہی

شیرینی جو اس کے لیے بحالت مرض، محتاج دلیل ہے، صحت یاب ہونے کے بعد بدیہی ہو جائے گی۔ وہ دوسروں سے دلیل طلب کرنے کے بجائے قند کی ڈلی زبان پر رکھ کر خود ہی پکار اٹھے گا کہ قند میٹھا ہوتا ہے یعنی اسے کسی دلیل کی حاجت نہیں رہے گی۔ جب تک وہ مریض ہے کوئی دلیل اس کے اندر یقین کا رنگ پیدا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ وہ یہی کہے گا کہ اے لوگو! میں تمہاری بات کس طرح مانوں؟ میرا تجربہ (ذائقہ) تو یہ بتا رہا ہے کہ قند کڑوا ہوتا ہے۔ بس اسی مثال سے اس مسئلے کو سمجھ لیجئے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ نفسِ امّارہ اپنی ذات کے اعتبار سے احکامِ شرعی کا منکر ہے۔ اس کی ذات کا تقاضا ہی یہ ہے کہ اسے احکامِ شرعی میں خرابی محسوس ہو۔ لہٰذا اس کے لیے، ان احکام کی خوبیوں (شیرینی) کا اعتراف کرنا ناممکن ہے۔ بدیں وجہ نفسِ امّارہ کا تزکیہ یعنی اسے ذاتی برائیوں اور خرابیوں سے پاک کرنا اشد ضروری ہے۔ تزکیۂ نفس کے بغیر یقین کا حصول ناممکن ہے چنانچہ ارشاد باری ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ط یقیناً کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے اس (نفسِ امّارہ) کا تزکیہ کر لیا اور یقیناً ناکام ہو گیا وہ شخص جس نے اسے گڑھے میں پوشیدہ کر دیا۔ پس ثابت ہو گیا کہ شریعت محمدیہ (کی خوبیوں) کا منکر ایسا ہی مریض ہے جیسا کہ قند و نبات کی حلاوت کا منکر۔ اگر کوئی نابینا ہو تو اس میں آفتاب کا کیا قصور ہے؟

سیر و سلوک، تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب سے مقصود یہ ہے کہ آفاتِ باطنی اور امراضِ قلبی کا ازالہ ہو جائے تاکہ ایمان کی حقیقت حاصل ہو سکے۔ آیت فِیْ

قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ان منافقین کے دلوں میں ایک خاص قسم کا مرض ہے، بیان ہے اسی حقیقت کا۔ آفات معنویہ (امراضِ قلبی) کی موجودگی میں جو ایمان ہوتا ہے وہ محض ظاہری اور رسمی ہوتا ہے کیونکہ نفسِ امّارہ برابر ایمان کے خلاف حکم صادر کرتا رہتا ہے۔ اور اپنے انکار (کفر) پر قائم رہتا ہے۔ اس قسم کے ظاہری ایمان والے کا حال وہی صفرا کے مریض کی طرح ہوتا ہے کہ لوگوں کے کہنے سے وہ ظاہری طور پر تو مان لیتا ہے کہ قند میٹھا ہوتا ہے مگر اس کا ذائقہ برابر یہ حکم لگاتا رہتا ہے کہ قند تو کڑوا ہوتا ہے۔ اس کے قند کے شیریں ہونے کا یقین اس وقت حاصل ہو گا جب صفرا دور ہو جائے گا۔ بس اسی طرح، انسان کے لئے ایمان کی حقیقت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے (وجدانی بنتی ہے) جب اس کے نفس کا تزکیہ ہو جائے یعنی جب اس کے امراضِ قلبی کا ازالہ ہو جائے

ایسا ایمان جو تزکیہ کے بعد حاصل ہوتا ہے، شک اور زوال دونوں سے محفوظ ہوتا ہے، چنانچہ یہ آیت۔ اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ؕ (آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے دوستوں کو نہ خوف ہوتا ہے نہ حزن۔) ایسے ہی لوگوں کے شان میں آئی ہے۔ اللہ تعالےٰ ہمیں بحرمۃ النبی الاُمی صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی ایمان کامل سے مشرف فرمائے ؞

ضروری تصحیح

بسلسلۂ تدبّرِ قرآن

دسمبر ۱۹۶۸ء کے میثاق میں تفسیر سورۂ مائدہ کی جو قسط شائع ہوئی ہے طبیعت کی خرابی کے سبب سے میں اس کا پروف اچھی طرح نہ پڑھ سکا اس وجہ سے اس میں غلطیاں بہت رہ گئی ہیں۔ صفحہ ۳۰ کی چوتھی سطر یوں چھپی ہے:۔

"یہود کے لیے جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، سبت کے دن دریائی شکار ممنوع تھا، اس امت کے لیے حالتِ احرام میں خشکی کا شکار ممنوع ہوا"

یہ عبارت در اصل یوں ہے:۔

"یہود کے لیے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، سبت کے دن دریائی شکار بھی ممنوع تھا، اس امت کے لیے حالت احرام میں صرف خشکی کا شکار ممنوع ہوا، دریائی شکار مباح رہا۔"

غلطیاں تو اور بھی ہیں لیکن ان کی تصحیح پڑھنے والے خود کر لیں گے۔ اس غلطی سے غلط فہمی کا امکان ہے۔ ان دنوں میں دورانِ سر کی تکلیف میں مبتلا ہوں اس وجہ سے کام ٹھیک نہیں ہو رہا ہے مخلصین سے عفو و درگزر اور دعا کی درخواست ہے۔ امین احسن اصلاحی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تدبرِ قرآن

دوسرے گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورۂ مائدہ پر، جیسا کہ ہم مقدمے میں واضح کر چکے ہیں، سورتوں کا پہلا گروپ تمام ہوا۔ اب یہ انعام سے دوسرا گروپ شروع ہے۔ اس میں چار سورتیں ہیں۔ انعام، اعراف، انفال اور برأت۔ انعام اور اعراف مکی ہیں، انفال اور براءت مدنی۔ انعام و اعراف دونوں میں خطاب اہل مکہ سے ہے۔ انعام میں توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی مسائل زیر بحث آئے ہیں اور اصل دین ابراہیمؑ کی وضاحت کی گئی ہے۔ بنائے استدلال تمام تر عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے شواہد پر ہے یا پھر ان مسلمات پر جن کو اہل عرب تسلیم بھی کرتے تھے اور جو صحیح بھی تھے۔

اعراف میں انذار کا پہلو غالب ہے۔ اس میں قریش پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ کسی قوم کے اندر ایک رسول کی بعثت کے مقتضیات و تضمنات کیا ہوتے ہیں، اس باب میں اللہ تعالیٰ کے قاعدے اور ضابطے کیا ہیں، اگر کوئی قوم اپنے رسول کی تکذیب پر جم جاتی ہے تو اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں، اس معاملے میں تاریخ کی شہادت کیا ہے اور اگر وہ اپنی ضد اور مکابرت کی اس روش سے باز نہ آئے تو اسے اپنے لیے کس روز بد کا انتظار کرنا چاہیے۔

انفال میں مسلمانوں کو اپنی کمزوریاں دور کر کے اللہ اور رسول کی اطاعت پر مجتمع ہونے اور کفار قریش سے جہاد پر ابھارا ہے۔ قریش کے متعلق صاف صاف یہ اعلان فرمایا ہے کہ ان کو بیت اللہ پر قابض رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، اس وراثت ابراہیمی کے حقدار مسلمان ہیں نہ کہ قریش۔ مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ تم ان سے مرعوب نہ ہو۔ اب ان کے لیے ذلت اور عذاب کا وقت آ چکا ہے۔ اگر یہ اپنی روش سے باز نہ آئے تو منہ کی کھائیں گے اور دنیا و آخرت دونوں میں کوئی بھی ان کو پناہ دینے والا نہیں ہو گا۔

سورۂ برأت میں کھلم کھلا قریش کو الٹی میٹم ہے۔ ان کے لئے صرف دو راہیں کھلی چھوڑی گئی ہیں۔

اسلام یا تلوار۔ مسلمانوں کو ان سے ہر قسم کے روابط قطع کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ جو مسلمان رشتہ و قرابت کی بنا پر ان سے درپردہ تعلق رکھتے تھے ان کو سخت سرزنش کی گئی ہے اور ان کے سامنے بھی واضح طور پر دو شکلیں رکھ دی گئی ہیں، یا تو اپنے آپ کو نفاق کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے سچے اور پکے مسلمان بن جائیں یا پھر اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہو جائیں جو اللہ و رسولؐ کے ان دشمنوں کا ہونے والا ہے۔

اس روشنی میں اگر تدبر کے ساتھ آپ اس گروپ کی تلاوت کریں گے معلوم ہوگا کہ ان چاروں سورتوں میں نہایت گہری حکیمانہ ترتیب ہے۔ انعام میں قریش پر اتمام حجت ہے، اعراف میں ان کو انذار ہے، انفال میں مسلمانوں کو جہاد کی تیاری کی ہدایت اور بیت اللہ کی تولیت سے قریش کی معزولی کا فیصلہ ہے۔ براءت میں قریش کو الٹی میٹم اور منافقین کو آخری تہدید ہے۔

پہلے گروپ میں اصل بحث اہل کتاب سے تھی، قریش سے اگر کہیں خطاب ہوا تھا تو ضمناً۔ برعکس اس کے اس گروپ میں اصل خطاب قریش سے ہے، اہل کتاب کا اس میں ذکر آیا ہے تو ضمناً۔ مواد استدلال میں بھی مخاطب کے اختلاف کے لحاظ سے بنیادی فرق ہے۔ اس گروپ میں بیشتر استدلال عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے شواہد سے ہے اور پہلے گروپ میں اہل کتاب کے تعلق سے وہ ساری چیزیں استدلال کے طور پر استعمال ہوئی ہیں جن کو اہل کتاب مانتے تھے۔ پہلے گروپ میں اہل کتاب کو امامت کے منصب سے معزول کیا گیا ہے اور ان کی جگہ مسلمانوں کو دی گئی ہے۔ اس گروپ میں قریش کو بیت اللہ کی تولیت سے معزول کیا گیا ہے اور اس کی خدمت امت مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے۔

یہ پورے گروپ پر ایک اجمالی تبصرہ ہوا۔ اب ہم اس کی ایک ایک سورہ کو الگ الگ لے کر اس کی تفسیر کریں گے۔ گروپ کی پہلی سورہ انعام ہے۔ اب ہم اللہ کا نام لے کر اس کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وبید اللہ التوفیق۔

طبع ہو گئی ہے **التکمیل فی اصول التاویل** (عربی) تالیف: مولانا حمید الدین فراہیؒ

شائع کردہ: دائرہ حمیدیہ، اعظم گڑھ — بڑا سائز، کاغذ عمدہ سفید، صفحات ۸۲
طباعت ٹائپ۔ قیمت: ساڑھے تین روپے

دارالاشاعت الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ، لاہور ۱

سورۂ انعام کا عمود
اور اس کے مطالب کا تجزیہ

سورۂ انعام میں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مخاطب قریش ہیں۔ ان کے سامنے توحید، معاد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے دلائل واضح کرتے ہوئے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ ہے کہ اگر انہوں نے یہ دعوت قبول نہ کی تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے ان کو تیار رہنا چاہیئے جس سے رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کو دوچار ہونا پڑا۔ اہل عرب چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی اولاد تھے اور ان کا دعوے یہ تھا کہ جس مذہب پر وہ ہیں یہ ان کو حضرت ابراہیمؑ ہی سے وراثت میں ملا ہے اس وجہ سے اس سورہ میں اس حجت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی تاکہ قریش پر یہ واضح ہو جائے کہ اصل ملتِ ابراہیمؑ کیا ہے اور اس کے حقیقی پیرو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ ہیں یا قریش۔!

سورہ کے اس عمود کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب ایک اجمالی نظر سورہ کے مطالب پر ڈالیئے۔

[۱-۵] توحید اور معاد کے بعض واضح دلائل کی طرف اشارہ۔ بالکل بدیہی حقائق سے اعراض پر اظہارِ تعجب۔ قرآن کی تکذیب ایک امر حق کی تکذیب ہے جس کا خمیازہ یہ بھگتیں گے۔ قرآن انہیں جن نتائج کی خبر دے رہا ہے وہ سب پیش آکے رہیں گے۔

[۶-۷] رسولوں کی تکذیب کرنے والے عذاب الٰہی میں پکڑے گئے۔ عرب کی پچھلی تاریخ کی طرف اشارہ۔

[۸-۱۱] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ کوئی بڑا سے بڑا معجزہ بھی ان جھٹلانے والوں کو قائل نہیں کر سکتا۔ جو معجزہ یہ مانگتے ہیں وہ بھی ان کو دکھا دو گے جب بھی یہ اپنے انکار سے باز نہیں آئیں گے۔ تم سے پہلے جو رسول آئے اس قماش کے لوگوں نے ان کا بھی مذاق اڑایا بالآخر وہ اس عذاب میں مبتلا ہو کے رہے جس کا انہوں نے مذاق اڑایا۔ ان کو اُن کے ملک کی تاریخ کی طرف توجہ دلاؤ۔

[۱۲-۱۳] آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کی ملکیت ہے۔ اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ جزا اور سزا کا دن لائے۔

[۱۴-۱۸] شرک سے اظہار برأت۔ خیر و شر سب خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ سب اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ حکیم و خبیر ہے۔

[۱۹-۲۴] توحید اور شرک کے باب میں فیصلہ کن شہادت اللہ کی ہے اور اللہ کی شہادت توحید کے حق میں ہے۔ یہ قرآن اسی شہادت کے ساتھ اترا ہے۔ سچے اہل کتاب بھی اس سے آشنا ہیں، صرف بدبخت ہی ہیں جو اس پر ایمان لانے سے محروم رہیں گے۔ جو لوگ شرک کے مدعی ہیں وہ خدا پر جھوٹ افترا کر رہے ہیں۔ ایسے ظالم فلاح نہیں پائیں گے۔ قیامت کے دن جب ان سے سوال ہوگا کہ تمہارے شرکاء کہاں ہیں تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے۔

[۲۵-۳۲] یہ لوگ اگر سنتے بھی ہیں تو سمجھنے اور ماننے کے لیے نہیں بلکہ کٹ حجتی کے لیے سنتے ہیں، قرآن ان کو پچھلے مکذبین کی جو سرگزشتیں سناتا ہے ان سے سبق حاصل کرنے کے بجائے، ان کو یہ اگلوں کا فسانہ کہتے ہیں۔ ان کی آنکھیں تو اسی وقت کھلیں گی جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت یہ اپنی بدبختی پر ماتم اور حسرت کریں گے کہ کاش پھر دنیا میں جانا ہوتا کہ ایمان لاتے۔ آج ان کے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، جس دن یہ اپنے رب کے حضور پیش کئے جائیں گے اس دن حسرت سے کہیں گے، ہائے ہماری بدبختی ہم نے اپنی زندگی کس طرح برباد کی۔

[۳۳-۳۹] پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ نشانی عذاب کا مطالبہ پورا نہ کئے جانے پر یہ جو تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں یہ چیز تمہارے لیے غم کا باعث نہ بنے۔ یہ تمہارا مذاق نہیں بلکہ خدا کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس معاملے کو خدا پر چھوڑو۔ تم سے پہلے جو انبیاء گزرے ہیں ان کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا تو انہوں نے صبر کیا۔ اس کے بعد اللہ کی نصرت ظاہر ہوئی۔ یہی سنت اللہ ہے اور سنت اللہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تمہیں اس معاملے میں پریشان نہیں ہونا چاہیئے۔ ایمان تو وہی لائیں گے جن کے اندر کچھ صلاحیت ہے، جن کے دل بالکل مُردہ ہو چکے ہیں وہ بڑی سے بڑی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ خدا کے آسمان و زمین نشانیوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن جو اندھے ہو چکے ہیں ان کو ان نشانیوں سے کیا فائدہ؟

[۴۰-۵۰] یہ عذاب کی نشانی مانگتے ہیں، ان سے پوچھو کہ اگر خدا کا عذاب آیا تو اس سے بچاؤ کا کیا سامان انہوں نے کر رکھا ہے؟ پچھلی قوموں کا حوالہ کہ انہوں نے بھی اپنے رسولوں سے نشانیاں مانگیں تو اللہ نے ان کو مختلف مصیبتوں میں مبتلا کیا لیکن خدا کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے ان کے دل اور سخت ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے ان کی جڑ ہی کاٹ دی۔ پیغمبرؐ کی طرف سے یہ اظہار و اعلان کریں خدا کے خزانوں کے مالک اور غیب کا عالم ہونے کا مدعی نہیں ہوں میں تو بس وحی الٰہی کا پیرو ہوں۔

[۵۱ - ۵۵] پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ جن کے اندر خدا اور آخرت کا خوف موجود ہے وہی اس قرآن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ سو ان کو اس کے ذریعہ سے جگاؤ۔ رہے وہ جو معجزات کے طالب ہیں تو ان کو نظر انداز کرو۔ جو غریب لوگ اللہ کی خوشنودی کے طالب اور تمہاری باتوں کے سننے والے ہیں ان کو ان متکبرین کے مطالبہ پر اپنے سے دور نہ کرو۔ اگر یہ متکبرین اس وجہ سے تمہارے پاس نہیں آتے کہ تمہاری مجلس میں غربا ہوتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو، تم ان کے ایمان و اسلام کے ذمہ دار نہیں ہو۔ ان کے لئے غریبوں کی غریبی اور ان کی اپنی امیری فتنہ بن گئی ہے۔ تم ان غربائے مسلمین کا بہرحال خیر مقدم کرو اور ان کو بشارت دو۔

[۵۶ - ۶۰] شرک سے اعلان بیزاری کی ہدایت اس لئے کہ اس کی کوئی دلیل نہیں۔ پیغمبر ایک واضح شہادت اپنے پاس رکھتا ہے اور یہ مکذبین اس شہادت کو تو جھٹلاتے ہیں، اور نشانی عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں۔ عذاب کا لانا پیغمبر کے اختیار میں نہیں، خدا کے اختیار میں ہے۔ ہر جان خدا کی مٹھی میں ہے۔ اللہ جب چاہے اور جہاں سے چاہے عذاب بھیج سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک وقت مقرر ہے۔ یہ جھٹلانے والے عنقریب جان لیں گے۔

[۶۸ - ۷۰] پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ جب دیکھو کہ ان مکذبین کو اعتراض و مخالفت کا بخار چڑھ گیا ہے تو ان سے بحث میں نہ الجھو، بلکہ کنارہ کش ہو جاؤ۔ تمہارا کام تذکیر و موعظت ہے جب دیکھو کہ وہ سننا نہیں چاہتے تو ان کو ان کے حال پر چھوڑو، یہ خود بھگتیں گے، تم ان کے ایمان و اسلام کے ذمہ دار نہیں ہو۔

[۷۱ - ۷۳] ان سے کہہ دو کہ حق واضح ہو جانے اور اللہ کی ہدایت آجانے کے بعد کیا ہماری مت ماری ہوئی ہے کہ ہم صحرا میں گم کردہ راہ قافلے کی طرح بھٹکتے پھریں؟ ہم تو اب اسی راہ پر چلیں گے جو خدا نے ہمارے لئے کھولی ہے۔

[۷۴ - ۸۳] توحید کے ثبوت میں حضرت ابراہیمؑ نے جو دلیل اپنی قوم پر قائم کی اس کا بیان۔

[۸۴ - ۹۰] حضرت ابراہیمؑ سے پہلے اور ان کے بعد ان کی ذریت میں جو انبیاء و رسل اس دین توحید کے حامل اٹھے، ان کی طرف ایک سرسری اشارہ اور اس بات کی تاکید کہ اصل ہدایت کی راہ یہی ہے جو ان پیغمبروں نے چھوڑی ہے تو اس پر مضبوطی سے استوار رہو۔ اگر کفار قریش اس کا انکار کرنا چاہتے ہیں تو ان کی پروا نہ کرو، اللہ دوسروں کو اس کی تائید و حمایت کے لیے کھڑا کر دے گا۔

[۹۱-۹۲] یہود کا القا کیا ہوا ایک اعتراض اور اس کا جواب۔

[۹۳-۹۴] اُن بد دماغوں کی تردید جو دعوے کرتے تھے کہ اگر وہ چاہیں تو وہ بھی اسی طرح کا کلام پیش کر سکتے ہیں جس قسم کا کلام محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کی طرف منسوب کر کے پیش کرتے ہیں، انہیں بھی وحی کا تجربہ ہوتا ہے۔

[۹۵-۹۹] توحید کے آفاقی دلائل۔

[۱۰۰-۱۰۵] شرک کی تردید اور یہ تنبیہ کہ ہدایت تمہارے پاس آچکی، اب جو گمراہی اختیار کرے گا تو ذمہ داری خود اس پر ہے۔

[۱۰۶-۱۰۸] پیغمبر مضبوطی سے وحی الٰہی کے اتباع پر جمے رہنے اور مشرکین سے اعراض کی ہدایت اور مسلمانوں کو یہ نصیحت کہ مشرکین کے بتوں اور معبودوں کی بے ضرورت تحقیر و تذلیل نہ کی جائے کہ وہ مشتعل ہو کر تمہارے خدا کو برا بھلا کہنے لگیں۔

[۱۰۹-۱۱۱] کفار کی اس قسم کی تردید کہ اگر ان کی طلب کے مطابق ان کو معجزہ دکھا دیا جائے تو وہ ضرور ایمان لائیں گے۔ فرمایا کہ اگر ان کو دنیا جہان کے معجزے دکھا دیئے جائیں جب بھی جو ایمان لانے والے نہیں ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

[۱۱۲-۱۱۷] اس سنت اللہ کا بیان کہ جب نبی کی دعوت بلند ہوتی ہے تو شیاطین جن و انس کو بھی یہ مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے باطل کو ملمع کر کے لوگوں کے سامنے پیش کریں تاکہ جن کو ان کی راہ اختیار کرنی ہے وہ ان کی راہ اختیار کریں۔ پیغمبر کو یہ ہدایت کہ تم ان الجھنے والوں کو بتا دو کہ جب میرے پاس خدا کی کتاب آچکی ہے تو میں اس کو چھوڑ کر کسی دوسری چیز کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں؟۔

[۱۱۸-۱۲۳] مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ تم ورغلانے والوں کی باتوں سے ہوشیار رہو۔ انہوں نے اپنے مشرکانہ عقائد کے تحت جو چیزیں حرام کر رکھی ہیں ان کے باب میں تم ان کی بدعات کی پروا نہ کرو بلکہ وہ چیزیں کھاؤ جن کی حرمت کی کوئی دلیل نہ ملت ابراہیمؑ میں موجود ہے، نہ قرآن نے ان کے حرام ہونے کی خبر دی ہے۔ اب خدا نے تمہیں تاریکی سے روشنی میں لا کھڑا کیا ہے تو تم ان لوگوں کی بدعات اور کج بحثیوں کی پروا نہ کرو جو بدستور کفر و شرک کے اندھیرے ہی میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

[۱۲۴-۱۲۷] ان مغروروں کی تردید جو قرآن پر ایمان لانے کی مشروط یہ ٹھہراتے تھے کہ جب تک ان پر بھی اسی طرح وحی نہ آئے جس طرح پیغمبر پر آتی ہے تب تک وہ اس پر ایمان نہ لائیں گے۔ فرمایا کہ نبوت کے

مرتبۂ بلند کا سزاوار ہر شخص نہیں ہوتا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کون اس کا اہل ہے، کون نہیں۔ جو لوگ کبر نفس میں مبتلا ہو کر دنیا اور آخرت دونوں کی سرفرازیوں کا اجارہ دار صرف اپنے کو سمجھتے ہیں وہ اپنے اس غرور کی سزا پائیں گے۔ رہا ایمان لانے اور نہ لانے کا معاملہ تو یہ اللہ کی توفیق پر منحصر ہے اور اس توفیق کے لیے ایک مخصوص سنت الٰہی ہے۔

[۱۲۸ - ۱۳۵] آخرت میں جنوں اور انسانوں کے گمراہ لوگ اعتراف کریں گے کہ وہ اتمام حجت کے باوجود محض اپنی شامت اعمال سے اس انجام کو پہنچے۔ قریش کو دھمکی کہ سنبھلنا چاہتے ہو تو اب بھی سنبھل جاؤ ورنہ جس عذاب کی دھمکی تمہیں سنائی جا رہی ہے وہ آکے رہے گا اور کوئی اس سے بچ نہ سکے گا۔

[۱۳۶ - ۱۴۴] مشرکین نے اپنے مشرکانہ عقائد کے تحت کھیتی اور چوپایوں میں سے جن چیزوں کو حرام ٹھہرا لیا تھا یا اپنے دیوتاؤں کو راضی کرنے کے لیے انسانی جانوں کی جو قربانیاں پیش کرتے تھے ان کی تردید و مذمت کہ یہ سب باتیں بے سر و پا اوہام پر مبنی ہیں۔ عقل، فطرت اور ملت ابراہیمؑ میں ان کی کوئی اصل نہیں ہے۔

[۱۴۵ - ۱۵۴] ملت ابراہیمؑ اور ملت موسوی میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئیں ان کی طرف ایک اشارہ۔ مشرکین کے اس عذر کی تردید کہ وہ جس راستہ پر ہیں، خدا ہی کے چلانے سے اس پر ہیں۔ اگر اللہ کو یہ راستہ پسند نہیں ہے تو وہ ان کو صحیح راستہ پر کیوں نہیں چلا دیتا؟

[۱۵۵ - ۱۶۵] اس قرآن کے ذریعہ سے جو اتمام حجت ہوا ہے اس کا بیان۔ اب اس کے بعد بھی اگر لوگ کسی نشانی کے ظہور کے منتظر ہیں تو وہ انتظار کریں، اس قسم کی نشانی دکھانا پیغمبرؐ کے اختیار میں نہیں ہے۔ پیغمبرؐ کی طرف سے یہ اعلان کہ خدا نے مجھے ملت ابراہیمؑ کی ہدایت بخشی ہے اور میں اس پر چل کھڑا ہوا ہوں۔ اب جس کا جی چاہے اس صراط مستقیم پر آئے اور جس کا جی چاہے بھٹکتا پھرے۔ اللہ کے ہاں ہر ایک اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

بقیہ اسلامی ریاست از صفحہ ۶۸

انگریزوں سے صدر کی مطلق العنانی میں تو مشکل ہی سے کوئی فرق پیدا ہوتا ہے البتہ ملک کی سیاسی زندگی میں بہت سی ناہمواریاں اور الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسلام خلیفہ کے لیے اس قسم کی غیر مسئولیت ایک لمحہ کے لیے بھی جائز تسلیم نہیں کرتا۔ اگر آج خلیفہ کا انتخاب ہو اور کل اس کے منتخب کرنے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص اس منصب کے لیے نااہل ہے تو وہ اس کو معزول کر سکتے ہیں۔ کم از کم قانون میں اس معزولی کو روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

تدبر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی

۶۔ تفسیر سورۂ الانعام

مکی ——— آیات ۱۶۵

(۱)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ؕ
ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ
ثُمَّ قَضٰۤى اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ وَهُوَ
اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ ۛ وَفِی الْاَرْضِ ۛ یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَیَعْلَمُ مَا
تَكْسِبُوْنَ ۝ وَمَا تَاْتِیْهِمْ مِّنْ اٰیَةٍ مِّنْ اٰیٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا
مُعْرِضِیْنَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ یَاْتِیْهِمْ
اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ اَلَمْ یَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ
مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَیْهِمْ
مِّدْرَارًا ۪ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ
وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِیْنَ ۝ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ كِتٰبًا
فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَیْدِیْهِمْ لَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ
اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا
مَلَكًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا یُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا
وَّلَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ ۝ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ

آیات ۱-۱۱

فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝

شکر کا سزاوار اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو اور بنایا تاریکیوں اور روشنی کو، پھر تعجب ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنے رب کے ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک مدت ٹھہرائی اور مدت مقررہ اسی کے علم میں ہے، پھر تعجب ہے کہ تم کج بحثیاں کرتے ہو! اور وہی اللہ آسمانوں میں بھی ہے اور وہی زمین میں بھی۔ وہ تمہارے خفیہ اور علانیہ کو جانتا ہے اور جو کمائی تم کر رہے ہو اسے بھی جانتا ہے۔ اور نہیں آتی ان کے پاس ان کے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی مگر یہ اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوتے ہیں۔ سو انہوں نے واضح حق کو بھی جھٹلا دیا جب کہ وہ ان کے پاس آیا تو عنقریب اس چیز کی خبریں ان کے پاس آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی قوموں کو ہلاک کر دیا جن کو ہم نے ملک میں وہ قوت و سطوت دے رکھی تھی جو تم کو نہیں دی اور ہم نے ان پر خوب مینہ برسائے اور نہریں جاری کیں جو ان کے نیچے بہتی تھیں، پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہم نے دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں۔ (۱-۶)

اور اگر ہم تم پر کوئی ایسی کتاب اتارتے جو کاغذ میں لکھی ہوئی ہوتی اور یہ اس کو اپنے ہاتھوں چھو بھی لیتے جب بھی یہ کفر کرنے والے یہی کہتے کہ یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اس پر علانیہ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اترتا اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو بس معاملے کا فیصلہ ہی ہو جاتا، پھر ان کو ذرا مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم اس کو کوئی فرشتہ بناتے جب بھی آدمی ہی کی شکل میں بناتے تو جو گھپلا وہ پیدا کر رہے ہیں ہم اسی میں ان کو ڈال دیتے اور تم سے پہلے بھی رسولوں کا مذاق اڑایا گیا تو جن لوگوں نے ان میں سے مذاق اڑایا ان کو اس چیز نے آگھیرا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ کہو، ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا! (۷-۱۱)

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ

ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (۱)

لفظ 'حمد' کی تحقیق تفسیر سورۂ فاتحہ میں گزر چکی ہے اور یہ بات بھی اس کتاب میں بار بار بیان ہو چکی ہے کہ مشرکین عرب آسمان و زمین اور نور و ظلمت سب کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ یہاں قرآن نے ان کے اسی مسلّمہ پر توحید کی دلیل قائم کی ہے کہ جب یہ تسلیم ہے کہ آسمانوں اور زمین اور نور و ظلمت کا خالق اللہ ہی ہے تو پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ یہ کفار دوسروں کو خدا کا ہم سر اور شریک ٹھہراتے ہیں۔ 'ثم' اظہارِ تعجب کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں اور آگے والی آیت میں بھی، اظہار تعجب ہی کے مفہوم میں ہے۔ شرک پر اظہار تعجب کا ایک پہلو تو یہی ہے کہ جب ساری چیزوں کا خالق خدا ہی ہے تو پھر شرک کی گنجائش کہاں سے نکلی؟ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کائنات کی چیزوں میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے مثلاً زمین اور آسمان، روشنی اور تاریکی، سردی اور گرمی، تو اس تضاد کے اندر اس کائنات کے مجموعی مقصد کے لیے ایسی حیرت انگیز سازگاری بھی ہے کہ کوئی عاقل تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان میں سے ہر ایک کے خالق و مالک الگ الگ ہیں۔ بلکہ ہر صاحب نظر یہ ماننے پر مجبور ہے کہ پوری کائنات ایک ہی کارفرما کے ارادے اور مشیت کے تحت حرکت کر رہی ہے۔

توحید کی دلیل عرب کے مسلّمات اور

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا ۭ وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝ وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ۭ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۔ ۲-۳

انسان کی ابتدائی خلقت سے معاد کی دلیل۔

'خلقکم من طین' سے مقصود انسان کی ابتدائی خلقت کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ فرمایا ہے وبدأ خلق الانسان من طین ۔ السجدہ (اور انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا) تمام ارضی مخلوقات کی زندگی کا آغاز مٹی ہی سے ہوا ہے۔ اس مضمون کو قرآن نے بار بار مختلف شکلوں سے بیان کیا ہے اور اس سے عام طور پر دو حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی ہے، ایک تو انسان کی بے حقیقتی کی طرف کہ مٹی سے پیدا ہونے والی مخلوق کو اپنی ہستی پر زیادہ مغرور نہیں ہونا چاہیے، دوسرے مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کئے جانے پر کہ جب انسان کو خدا نے مٹی سے پیدا کیا اور اس پیدا کرنے میں اس کو کوئی دشواری پیش نہیں تو اب دوبارہ اس کے پیدا کرنے سے وہ کیوں عاجز رہے گا۔ یہاں اس دوسری حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اس کا ذکر ہوا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ

(اور اگر تم تعجب کرنا چاہو تو نہایت ہی عجیب ہے ان کی یہ بات کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا دوبارہ نئی خلقت میں آئیں گے۔) كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ ۱۰۴۔ انبیا (جس طرح ہم نے پہلی بار مٹی سے بنایا اسی طرح مٹی ہو جانے کے بعد دوبارہ اس کو پیدا کر دیں گے، یہ ہمارے ذمہ وعدہ ہے، یہ ہم کر کے رہیں گے) وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ ۲۷۔ روم (اور وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ اس کے لیے سہل ہے)

اجل کے مختلف مفہوم

'ثم قضیٰ اجلاً' 'اجل' کے معنی مدت مقرر کے ہیں۔ 'اجل' یا 'اجل مسمّٰی' کا لفظ فرد یا اقوام کے تعلق سے مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک تو اس مدت حیات کے لیے استعمال ہوا ہے جو ہر فرد کو تقدیر کی طرف سے ملی ہے۔ دوسرے اس روز بعث کے لیے استعمال ہوا ہے جو خلق کے اٹھائے جانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے۔ تیسرے اس مقررہ پیمانہ کے لیے استعمال ہوا ہے جو کسی قوم کی ہلاکت کے لیے مقرر ہے۔ پہلے معنی کے لیے نظیر آیت زیر بحث میں بھی ہے اور اسی سورہ کی آیت ۶۰ میں بھی۔ فرمایا ہے، وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۶۰ (اور وہی خدا ہے جو تمہیں وفات دیتا ہے شب میں اور وہ جانتا ہوتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہوتا ہے، پھر وہ تم کو دوسرے دن میں اٹھاتا ہے تاکہ تمہاری مقررہ مدت پوری کی جائے، پھر اسی کی طرف تمہارا لوٹنا ہوگا، پھر وہ تم کو آگاہ کرے گا ان سارے کاموں سے جو تم کرتے رہے ہو) دوسرے معنی کے لئے نظیر آیت زیر بحث میں ہے۔ اس میں 'اجل' کا ذکر دو مرتبہ ہے۔ ایک اجل تو ظاہر ہے کہ وہی ہے جو ہر فرد کی مدت حیات کے طور پر مقرر ہے، دوسری 'اجل' جس کے ساتھ 'مسمّٰی' کی صفت لگی ہوئی ہے، قرینہ دلیل ہے کہ اس سے وہ مدت مقررہ مراد ہے جو خلق کے اٹھائے جانے کے لئے مقرر ہے۔ تیسرے معنی کے لیے نظیر آیت لِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ۔ ۳۴۔ اعراف، اور اس مضمون کی دوسری آیات میں ہے۔ اس اجل سے، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وہ مقررہ پیمانہ مراد ہے جو کسی قوم کے اخلاقی زوال کی اس آخری حد کی خبر دیتا ہے جب قانون الٰہی اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ یہ پیمانہ، افراد کی مدت حیات کی طرح نہیں ہے کہ کوئی نیک ہو یا بد جو مدت

حیات اس کے لیے مقرر ہے اس کے ختم ہو جانے پر وہ لازماً مر جاتا ہے بلکہ یہ اخلاقی قوانین کے تابع ہے، جب تک کوئی قوم اپنے ایمان و کردار کو محفوظ رکھے گی خدا اس کو قائم رکھے گا، یہاں تک کہ وہ اجل مسمّٰی آجائے جو اس پوری کائنات کے لیے خدا کی طرف سے مقرر ہے۔ اس پیمانہ کے اخلاقی ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ ایک قوم کا پیمانہ لبریز ہونے کی آخری حد پر پہنچ رہا ہو اور اس کی اجل مسمّٰی آئی کھڑی ہو لیکن سوئی کے آخری نقطہ پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ قوم توبہ اور اصلاح کے ذریعہ سے اپنے زندہ رہنے کا حق پھر بحال کر لے۔ یہاں ہم اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ سورۂ نوح کی تفسیر میں ہم اس نکتہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

'امتراء' 'مری' سے ہے جس کے معنی متھنے 'مسنے' نچوڑنے کے ہیں 'امتری اللبن' کے معنی ہوں گے اس نے تھن سے دودھ نچوڑا۔ یہیں سے یہ لفظ اس بحث و جدال کے لیے استعمال ہوا جس میں کوئی کٹ حجتی کرنے والا مناظر اس بات میں سے بھی شک اور اعتراض کا کوئی پہلو نکال ہی لے جس میں اعتراض و بحث کی کوئی گنجائش بھی نہ ہو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہی خدا ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے تمہیں بھی انکار نہیں۔ پھر ہر ایک کے لیے اس نے زندگی کی ایک مدت ٹھہرا دی، یہ نہیں ہے کہ جو پیدا ہوتا ہو وہ غیر فانی ہو کر پیدا ہوتا ہو، پھر اس میں کیا شک کی گنجائش ہے کہ جس خدا نے تمہیں مٹی سے بنایا وہ تمہیں دوبارہ اس مٹی سے اٹھا کھڑا کرے گا اور اس کے لیے اس نے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس کا علم صرف اسی کو ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جس میں کسی بحث و جدال کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن تم ہر بات میں کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتے ہو۔

'وھو اللہ فی السمٰوٰت والارض الایہ' یعنی زمین و آسمان میں الگ الگ اللہ نہیں ہیں بلکہ وہی اللہ آسمان و زمین دونوں کا مالک ہے اور دونوں میں اسی کا حکم چل رہا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے 'وھو الذی فی السماء الٰہ و فی الارض الٰہ وھو العلیم الحکیم' ۴۳ - زخرف (وہی ہے جو آسمان کا بھی معبود ہے اور وہی زمین کا بھی معبود ہے اور وہ علیم و حکیم ہے) آسمان و زمین دونوں کا قیام و بقا ہی اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ ان دونوں کے اندر ایک ہی خدا کا ارادہ کارفرما ہے۔ اگر ان کے اندر الگ الگ ارادے کارفرما ہوتے تو جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے دونوں درہم برہم ہو جاتے۔ یہ مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ آسمان و زمین کا خالق تو خدا ہی ہے لیکن چونکہ زمین اس کی مملکت کا دور دراز حصہ ہے اس

وجہ سے اس نے اس کا انتظام و انصرام اپنے دوسرے کارندوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے۔ آسمان و زمین سب براہ راست اسی کے کنٹرول میں ہیں اور اس کا علم تمہارے ظاہر و باطن اور تمہارے قول و فعل ہر چیز پر محیط ہے اس وجہ سے اس کو اپنی اس مملکت میں کسی مددگار کی احتیاج بھی نہیں ہے۔

توحید کا مضمون اوپر قیامت والے مضمون کی تاکید ہے۔ یہ حقیقت قرآن میں بار بار واضح کی گئی ہے کہ قیامت کا ماننا اس لیے ضروری ہے کہ قیامت کو مانے بغیر یہ سارا کارخانہ ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتا ہے اور یہی بات اس صورت میں بھی لازم آتی ہے جب قیامت کے ساتھ شرک اور شفاعت باطل کی گنجائش تسلیم کر لی جائے۔ اس لئے کہ جب شرک اپنے پرستاروں کو بہرصورت بخشوا لیں گے، جیسا کہ مشرکین کا دعوے ہے خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں تو پھر قیامت کا آنا نہ آنا دونوں یکساں ہی رہا۔

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝ فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴-۵) یعنی توحید اور قیامت کی ان باتوں کی تکذیب کی کوئی گنجائش تو نہیں ہے لیکن یہ لوگ اللہ کی آیات سے اعراض کر رہے ہیں اور اس طرح انہوں نے اس حق کو جھٹلایا ہے جو اللہ کی طرف سے ان کے پاس آیا ہے۔ تو عنقریب اس چیز کی خبریں ان کے پاس آئیں گی جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں۔ یہاں 'حق' سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن پیغمبر کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب سے ڈرا رہا تھا لوگ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ جس عذاب کا مذاق اڑا رہے ہیں اس کے آثار کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ - ۶

یہ تاریخ کی شہادت پیش کی گئی ہے اوپر والے دعوے پر۔ مطلب یہ ہے کہ قریش کو یہ غرہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کو بڑی قوت و شوکت حاصل ہے، ان کو ہلایا نہیں جا سکتا، ان سے پہلے کتنی قومیں ہیں جن کو ان سے زیادہ اقتدار حاصل ہوا، ان کو رزق و فضل میں سے بھی ان سے کہیں زیادہ حصہ ملا لیکن جب انہوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی تو خدا نے ان کو ہلاک کر دیا اور ان کے

بعد ان کی جگہ دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں۔ یہاں تاریخ کا یہ حوالہ اجمال کے ساتھ آیا ہے، اس کی پوری تفصیل اعراف میں آئے گی جو اس سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'سماء' کا لفظ بادلوں کے لیے بھی آتا ہے۔ 'مدرار' کے اندر مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور بارش کی کثرت رزق و فضل کی کثرت کی تعبیر ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ ہود آیت ۵۲، اور سورۂ نوح آیت ۱۱۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ○ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۔ (۷-۹)

اوپر آیت ۴ میں قرآن سے ان کے اعراض کا جو ذکر فرمایا تو یہ ان کے ان مطالبات و اعتراضات کا جواب بھی دے دیا جو وہ اس اعراض کے لیے بطور بہانہ کے پیش کرتے تھے۔ مقصود اس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ یہ نہ خیال کرو کہ ان کے اعراض کے لئے فی الواقع کوئی عذر ہے، جو دور ہو جائے تو یہ قرآن کو مان لیں گے۔ نہیں، آپ وہیں رہیں گے جہاں اب ہے، یہ کوئی نہ کوئی نیا بہانہ تراش لیں گے۔ اس لئے کہ نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہیں معجزے نہیں دکھائے گئے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کے خلاف کوئی بات ماننے کے لئے یہ تیار نہیں ہیں۔

'لو نزلنا علیک کتابا فی قرطاس الآیہ' یہ اس مطالبے کا جواب ہے جو اہل کتاب کی زبانی سورۂ نساء آیت ۱۵۳ میں نقل ہوا ہے۔ وہاں اس کا وہ جواب دیا ہے جو اہل کتاب کے لیے موزوں تھا۔ یہاں فرمایا کہ ان کے مطالبہ کے مطابق اگر فی الواقع ان پر لکھی لکھائی ما بین الدفتین کتاب بھی اتار دی جاتی جب بھی یہ ایمان نہ لاتے بلکہ کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

'وقالوا لولا انزل علیہ ملک الآیہ' یہ ان کا ایک دوسرا مطالبہ اور اس کا جواب ہے اور یہ مطالبہ بھی قرآن میں دوسری جگہ نقل ہوا ہے۔ یہ مطالبہ یہ تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر فرشتہ آتا ہے، جیسا کہ ان کا دعوے ہے تو وہ فرشتہ یوں کیوں آتا ہے کہ صرف انہی کو نظر آتا ہے، کھلم کھلا ان کی نبوت کی منادی کرتا ہوا کیوں نظر نہیں آتا کہ سب دیکھیں اور سب سنیں۔ اس کا جواب یہ دیا کہ جب بات یہاں تک پہنچ جائے گی کہ فرشتے علانیہ اترنے لگیں تو پھر اللہ کا عذاب آ دھمکے گا، پھر ان کو مہلت نہیں دی جائے گی۔ یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے،

کہ ایمان وہ معتبر ہے جو غیب میں رہتے، آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے ان دلائل کی بنیاد پر لایا جائے، جن کی انبیا دعوت دیتے ہیں نہ کہ وہ جو کشف حجاب اور حقائق کا بچشم سر مشاہدہ کر لینے کے بعد لایا جائے۔

'ولو جعلناہ ملکا لجعلناہ رجلا الایہ' یہ ایک تیسرے مطالبے کا جواب ہے اور یہ بھی قرآن میں دوسری جگہ نقل ہوا ہے۔ مثلاً وما منع الناس ان یؤمنوا اذ جاءھم الھدیٰ الا ان قالوا ابعث اللہ بشرا رسولا ۱۷-۹۴ اسراء (اور ہدایت الٰہی کے آجانے کے بعد لوگوں کو ایمان سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ انہوں نے اعتراض کیا کہ کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا) فقالوا ابشر یھدوننا فکفروا وتولوا واستغنی اللہ ۶۴-تغابن (پس وہ بولے کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے، پس انہوں نے انکار کر دیا اور پیٹھ پھیر لی اور اللہ بھی ان سے بے نیاز ہو گیا) اس کا جواب یہ دیا کہ اگر رسول بالفرض فرشتہ ہی بھیجا جاتا جب بھی لازماً وہ آدمی ہی کی شکل و صورت میں ہوتا تو پھر وہی گھپلا پیش آ جاتا جو اب پیش آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی فرشتے کو رسول بنا کر نہ بھیجنا اس بنا پر نہیں ہے کہ خدا کے لیے یہ ناممکن تھا بلکہ اس بنا پر ہے کہ انسان فرشتوں کو فرشتوں کی شکل میں نہیں بلکہ انسانوں ہی کی شکل میں دیکھ سکتے اور اسی صورت میں ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو جب وہ انسان ہی کی روپ میں آتا تو یہ پھر وہی اعتراض اٹھاتے جواب اٹھا رہے ہیں۔ 'مایلبسون' سے یہاں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ فی الواقع یہ شبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ لوگ یہ شبہ پیدا کر رہے ہیں تاکہ اس طرح اپنے سادہ لوح پیروؤں کو گھپلے میں ڈالیں۔ اور 'لبسنا' میں فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے تو یہ نسبت اسی طرح کی ہے جس طرح کی نسبت 'فلما زاغوا ازاغ اللہ' میں ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ۝ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (۱۰-۱۱)

'حاق یحیق حیقا بہ' کے معنی ہیں احاطہ کر لینا، گھیر لینا اور چھا جانا۔

اوپر آیت ۵ میں قریش کو یہ دھمکی جو دی ہے کہ وہ ایک امر حق کا مذاق اڑا رہے ہیں جو شدنی اور اٹل ہے وہ عنقریب اس عذاب کے آثار دیکھ لیں گے جس کی ہنسی اڑا رہے ہیں، اب یہ اس امر واقعی کی شہادتیں اور مثالیں جو خود ان کی تاریخ اور ان کے ملک کے آثار میں موجود ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم سے پہلے جو رسول آئے انہوں نے بھی اپنی اپنی قوموں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا تو ان کا بھی اسی طرح

فرشتہ کو رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا؟

تکذیب رسول کے نتائج تاریخ کی روشنی میں

بعد ان کی جگہ دوسری قومیں اٹھا کھڑی کیں۔ یہاں تاریخ کا یہ حوالہ اجمال کے ساتھ آیا ہے۔ اس کی پوری تفصیل اعراف میں آئے گی جو اس سورہ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'سماء' کا لفظ بادلوں کے لیے بھی آتا ہے۔ 'مدرار' کے اندر مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور بارش کی کثرت رزق و فضل کی کثرت کی تعبیر ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ ہود آیت ۵۲، اور سورۂ نوح آیت ۱۱۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِىْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ط وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ○ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۔ (۷-۹)

اوپر آیات ۴ میں قرآن سے ان کے اعراض کا جو ذکر فرمایا تو یہ ان کے ان مطالبات و اعتراضات کا جواب بھی دے دیا جو وہ اس اعراض کے لیے بطور بہانہ کے پیش کرتے تھے۔ مقصود اس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ یہ نہ خیال کرو کہ ان کے اعراض کے لئے فی الواقع کوئی عذر ہے، جو دور ہو جائے تو یہ قرآن کو مان لیں گے۔ نہیں، یہ وہیں رہیں گے جہاں اب ہیں، یہ کوئی نہ کوئی نیا بہانہ تراش لیں گے۔ اس لئے کہ نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہیں معجزے نہیں دکھائے گئے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ اپنی خواہشوں کے خلاف کوئی بات ماننے کے لئے یہ تیار نہیں ہیں۔

'ولو نزلنا علیک کتابا فی قرطاس الآیہ' یہ اس مطالبے کا جواب ہے جو اہل کتاب کی زبانی سورۂ نساء آیت ۱۵۳ میں نقل ہوا ہے۔ وہاں اس کا وہ جواب دیا ہے جو اہل کتاب کے لیے موزوں تھا۔ یہاں فرمایا کہ ان کے مطالبہ کے مطابق اگر فی الواقع ان پر لکھی لکھائی ما بین الدفتین کتاب بھی اتار دی جاتی جب بھی یہ ایمان نہ لاتے بلکہ کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

'وقالوا لولا انزل علیہ ملک الآیہ' یہ ان کا ایک دوسرا مطالبہ اور اس کا جواب ہے اور یہ مطالبہ بھی قرآن میں دوسری جگہ نقل ہوا ہے۔ یہ مطالبہ یہ تھا کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر فرشتہ آتا ہے، جیسا کہ ان کا دعوے ہے تو وہ فرشتہ یوں کیوں آتا ہے کہ صرف انہی کو نظر آتا ہے، کھلم کھلا ان کی نبوت کی منادی کرتا ہوا کیوں نظر نہیں آتا کہ سب دیکھیں اور سب سنیں۔ اس کا جواب یہ دیا کہ جب بات یہاں تک پہنچ جائے گی کہ فرشتے علانیہ اترنے لگیں تو پھر اللہ کا عذاب آ دھمکے گا، پھر ان کو مہلت نہیں دی جائے گی۔ یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جو قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے،

کہ ایمان وہ معتبر ہے جو غیب میں رہتے، آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے ان دلائل کی بنیاد پر لایا جائے، جن کی انبیاء دعوت دیتے ہیں نہ کہ وہ جو کشف، حجاب اور حقائق کا بچشم سر مشاہدہ کر لینے کے بعد لایا جائے۔

'ولو جعلناہ ملکا لجعلناہ رجلا الایۃ' یہ ایک تیسرے مطالبے کا جواب ہے اور یہ بھی قرآن میں دوسری جگہ نقل ہوا ہے۔ مثلاً وما منع الناس ان یؤمنوا اذ جاءھم الھدیٰ الا ان قالوا ابعث اللہ بشرا رسولا ۱۷ - اسراء (اور ہدایت الٰہی کے آجانے کے بعد لوگوں کو ایمان سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ انہوں نے اعتراض کیا کہ کیا اللہ نے ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا) فقالوا ابشر یھدوننا فکفروا وتولوا واستغنی اللہ - ۶۴ - تغابن (پس وہ بولے کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے، پس انہوں نے انکار کر دیا اور پیٹھ پھیر لی اور اللہ بھی ان سے بے نیاز ہو گیا) اس کا جواب یہ دیا کہ اگر رسول بالفرض فرشتہ ہی بھیجا جاتا جب بھی لازماً وہ آدمی ہی کی شکل و صورت میں ہوتا تو پھر وہی گھپلا پیش آ جاتا جو اب پیش آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی فرشتے کو رسول بنا کر نہ بھیجنا اس بنا پر نہیں ہے کہ خدا کے لیے یہ ناممکن تھا بلکہ اس بنا پر ہے کہ انسان فرشتوں کو فرشتوں کی شکل میں نہیں بلکہ انسانوں ہی کی شکل میں دیکھ سکتے اور اسی صورت میں ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو جب وہ انسان ہی کی روپ میں آتا تو یہ پھر وہی اعتراض اٹھاتے جواب اٹھا رہے ہیں۔ 'مایلبسون' سے یہاں یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے کہ فی الواقع یہ شبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ لوگ یہ شبہ پیدا کر رہے ہیں تاکہ اس طرح اپنے سادہ لوح پیروؤں کو گھپلے میں ڈالیں۔ اور 'لبسنا' میں فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے تو یہ نسبت اسی طرح کی ہے جس طرح کی نسبت 'فلما زاغوا ازاغ اللہ' میں ہے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ۝ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ثُمَّ انظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (۱۰-۱۱)

'حاق یحیق حیقا بہ' کے معنی ہیں احاطہ کر لینا، گھیر لینا اور چھا جانا۔

اوپر آیت ۵ میں قریش کو یہ دھمکی جو دی ہے کہ وہ ایک امر حق کا مذاق اڑا رہے ہیں جو شدنی اور اٹل ہے وہ عنقریب اس عذاب کے آثار دیکھ لیں گے جس کی ہنسی اڑا رہے ہیں، اب یہ اس امر واقعی کی شہادتیں اور مثالیں، جو خود ان کی تاریخ اور ان کے ملک کے آثار میں موجود ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم سے پہلے جو رسول آئے انہوں نے بھی اپنی اپنی قوموں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا تو ان کا بھی اسی طرح

مذاق اڑایا گیا بالآخر اس عذاب نے ان کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور وہ تباہ ہوگئیں۔

'قل سیروا فی الارض الایہ' یہ اشارہ ہے خود ملک عرب کی طرف کہ اگر اس نگاہ سے اپنے ملک کے حالات و آثار کا مشاہدہ کرو تو تمہیں اس میں رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کی تباہی کے بہت سے آثار ملیں گے۔ یہاں صرف اجمالی اشارہ فرمایا ہے۔ بعد والی سورہ میں اس اجمال کی تفصیل آئے گی۔ وہاں قوم نوح، عاد، ثمود، مدین، قوم لوط وغیرہ کی سرگزشتیں سنائی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کے انذار کا مذاق اڑایا اور اس عذاب کو انہوں نے محض خالی خولی دھمکی سمجھا جس کی رسول نے خبر دی۔ بالآخر وہ واقعہ کی شکل میں نمودار ہوگیا اور مذاق اڑانے والوں کا بیڑا غرق ہوگیا۔

۲۔ آگے کا مضمون، آیات ۱۲-۳۲

آگے توحید، معاد اور رسالت کے وہی مطالب جو اوپر گزرے اپنے بعض نئے پہلوؤں اور نئے اسلوب سے آرہے ہیں۔ ارشاد ہے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلْ لِّلّٰهِ ؕ كَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ؕ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰی يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِی الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾ قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّیْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾ قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِیْ وَبَيْنَكُمْ ؕ وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ؕ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ

قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنَّنِي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ ﴿١٩﴾
الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمُ
الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٢٠﴾ وَمَنْ أَظْلَمُ
مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ
الظَّالِمُونَ ﴿٢١﴾ وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا
أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ
فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿٢٣﴾ انْظُرْ
كَيْفَ كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾
وَمِنْهُمْ مَنْ يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَنْ
يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا
بِهَا ۚ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا
إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٥﴾ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ وَإِنْ
يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى
النَّارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا وَنَكُونَ مِنَ
الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٧﴾ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَا كَانُوا يُخْفُونَ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَوْ
رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿٢٨﴾ وَقَالُوا إِنْ
هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوثِينَ ﴿٢٩﴾ وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا
عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۚ قَالَ أَلَيْسَ هَٰذَا بِالْحَقِّ ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَرَبِّنَا ۚ قَالَ
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٠﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ
كَذَّبُوا بِلِقَاءِ اللَّهِ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوا
يَا حَسْرَتَنَا عَلَىٰ مَا فَرَّطْنَا فِيهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ
ظُهُورِهِمْ ۚ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ﴿٣١﴾ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَعِبٌ
وَلَهْوٌ ۖ وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٣٢﴾

ان سے پوچھو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے؟ کہہ دو، اللہ ہی کا ہے۔
اس نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ وہ تم کو جمع کر کے ضرور لے جائے گا قیامت

کے دن کی طرف جس میں ذرا شبہ نہیں۔ جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔ اور اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے جو چیز شب میں ساکن ہوتی ہے اور جو دن میں متحرک ہوتی ہے اور وہ سمیع و علیم ہے۔ ۱۲-۱۳

کہو کیا میں اللہ کے سوا، جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، کسی اور کو اپنا کارساز بناؤں اور وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں، کہہ دو مجھے تو حکم ملا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا بنوں اور تم ہرگز مشرکوں میں سے نہ بنو۔ کہہ دو کہ اگر میں نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی تو میں ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ جو شخص اس دن اس سے دور رکھا گیا درحقیقت وہی ہے جس پر خدا نے رحم فرمایا اور یہی کھلی کامیابی ہے۔ ۱۴-۱۶

اور اگر اللہ تجھ کو کسی دکھ میں مبتلا کرے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو اس کا دور کرنے والا بن سکے اور اگر کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح حاوی ہے اور وہ حکیم و خبیر ہے۔ پوچھو شہادت کے لیے سب سے بڑا کون ہے؟ کہو، اللہ۔ وہ میرے اور تمہارے درمیان گواہ ہے اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعہ سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔ کیا تم اس بات کے گواہ بنتے ہو کہ خدا کے ساتھ کچھ اور معبود بھی ہیں؟ کہہ دو، میں اس کی گواہی نہیں دیتا۔ کہہ دو وہ تو بس ایک ہی معبود ہے اور میں ان سے بری ہوں جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو۔ ۱۷-۱۹

جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا وہی ہیں جو اس پر ایمان نہیں لاتے۔ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا یا اس کی آیات کی تکذیب کی، بے شک یہ ظالم فلاح پانے والے نہیں۔ یاد کرو اس دن کو جس دن ہم ان سب کو اکٹھا کریں گے پھر پوچھیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم ہمارا شریک گمان کرتے تھے؟ پھر ان کے فریب کا پردہ چاک ہو جائے گا مگر یہ کہیں گے کہ اللہ اپنے رب کی قسم! ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھو، یہ کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولے اور ان کا سارا افترا ہوا ہو گیا۔ ۲۰-۲۴

اور ان میں ایسے بھی ہیں جو تمہاری بات پر کان لگاتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں

پردے ڈال دیئے ہیں کہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرا پن پیدا کر دیا ہے کہ اس کو نہ سن سکیں اور اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں گے تو بھی ان پر ایمان نہیں لائیں گے۔ یہاں تک کہ جب یہ تمہارے پاس حجت کرتے آئیں گے تو یہ کافر کہیں گے کہ یہ تو بس اگلوں کا فسانہ ہے۔ اور یہ اس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی گریز کرتے ہیں اور یہ درحقیقت اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں لیکن احساس نہیں کر رہے ہیں۔ اور اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ دوزخ کے کنارے پر کھڑے کئے جائیں گے، پس کہیں گے کہ کاش ہم پھر واپس کئے جائیں کہ مانیں اور اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کریں اور ایمان والوں میں سے بنیں۔ بلکہ یہ تو ان پر وہی حقیقت ظاہر ہوئی ہے جو اس سے پہلے اپنے دل میں چھپاتے تھے اور اگر یہ لوٹائے جائیں تو وہی کریں گے جس سے روکے گئے۔ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ۲۵-۲۸

کہتے ہیں کہ زندگی تو بس یہی دنیا کی زندگی ہے، اور مرنے کے بعد ہم اٹھائے نہیں جانے کے۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب یہ اپنے رب کے حضور کھڑے کئے جائیں گے، وہ ان سے پوچھے گا، کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے؟ وہ جواب دیں گے، ہاں، ہمارے رب کی قسم، یہ امر واقعہ ہے! فرمائے گا پس چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔ گھاٹے میں رہے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی اچانک آپہنچے گی وہ کہیں گے کہ ہائے افسوس ہماری اس کوتاہی پر جو اس باب میں ہم سے ہوئی! اور وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے! اور یہ دنیا کی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے۔ البتہ دار آخرت ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو تقویٰ رکھتے ہیں۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں! ۲۹-۳۲

۳۔ الفاظ و اسالیب کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۔ ۱۲-۱۳

'قل لمن ما فی السموات والارض قل للہ' قرآن میں جہاں جہاں سوال کر کے مخاطب کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود اس کا جواب دیا ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع میں اصل جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے اور اگر اس کا کوئی عقیدہ یا عمل اس کے خلاف ہے تو وہ خود اس کے اپنے مسلّمہ کے خلاف ہے۔ جواب میں سبقت سے اس امر کا بھی اظہار ہو جاتا ہے کہ بہرحال اصل حقیقت کا اظہار کر دیا جائے۔ قطع نظر اس سے کہ مخاطب اس کے جواب میں کیا ہٹ دھرمی اختیار کرتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود آسمان و زمین کا خالق و مالک خدا ہی کو مانتے تھے۔ اس کی وضاحت دلائل کے ساتھ ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔

سوال و جواب کا ایک خاص اسلوب

'کتب علی نفسہ الرحمۃ' یہ اللہ تعالیٰ کے صفت رحمت سے کمال درجہ متصف ہونے کی تعبیر بھی ہے اور اس امر کا اظہار بھی کہ ہر وہ بات جو اس صفت کا مقتضیٰ ہے اس کا ظہور میں آنا قطعی اور اٹل ہے، کوئی چیز اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکے گی۔

صفت رحمت کا لازمی تقاضا

'لیجمعنکم الی یوم القیٰمۃ لاریب فیہ' میں عربیت کا جو اسلوب ہے اس پر سورۂ نساء کی آیت ۸۷ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ یہاں جو بات نگاہ میں رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ قیامت کا آنا خدا کی صفت رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر قیامت نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کائنات کا خالق رحمان و رحیم نہیں ہے، اس کے نزدیک نعوذ باللہ عدل و ظلم، نیکی اور بدی خیر اور شر دونوں یکساں ہیں، یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک اندھیر نگری ہے۔ یہ باتیں چونکہ بداہت باطل ہیں، رحمان و رحیم خدا کی شان کے بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے غایت و بے مقصد کام کرے اس وجہ سے لازمی ہے کہ ایک ایسا دن وہ لائے جس میں اس کی رحمت کامل کا ظہور ہو۔ اپنے نیک بندوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور جو بدکار و نابکار ہیں وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ قیامت کا اصل مقصود مجرموں کو سزا دینا نہیں بلکہ نیکوکاروں کو جزا دینا ہے، مجرموں کی سزا درحقیقت نیکوکاروں کی جزا کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ آگے آیت ۵۴ کے تحت اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

'الذین خسروا انفسھم فھم لا یؤمنون' کے مضمون کی وضاحت آگے آیت ۳۱ میں فرمائی ہے۔ 'قد خسر الذین کذبوا بلقاء اللہ حتیٰ اذا جاءتھم الساعۃ بغتۃ قالوا یا حسرتنا علیٰ ما فرطنا فیھا وھم

اصل خسران

یحملون اوزارھم علی ظھورھم الاساء ما یزرون (گھاٹے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا ۔ یہاں تک کہ جب وہ گھڑی اچانک آ دھمکے گی تو کہیں گے ہائے افسوس ہماری اس کوتاہی پر جو ہم سے اس بارے میں ہوئی اور وہ اس دن اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوئے ہوں گے اور آگاہ! نہایت برا بوجھ ہوگا جو وہ اٹھائے ہوئے ہوں گے ۔)

حذف کا ایک اسلوب

ولہ ما سکن فی اللیل والنھار، یہاں لیل و نہار دونوں کے ذکر کا تقاضا یہ ہے کہ 'سکن' کے بالمقابل کوئی ایسا فعل محذوف مانا جائے جو لفظ 'نہار' کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ہو ۔ چنانچہ ہم نے 'تحرک' محذوف مانا ہے اور ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے ۔ اس اسلوب کی وضاحت دوسرے مقامات میں ہو چکی ہے اور آگے اسی سورہ میں اس کی نہایت عمدہ مثالیں آ رہی ہیں ۔

آیات کا مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ اپنی موجودہ دنیوی کامیابیوں کے غرّے میں آخرت اور جزا و سزا کو جھٹلا رہے ہیں اور تمہارا اور قرآن کا مذاق اڑا رہے ہیں تو ان سے پوچھو کہ یہ آسمان و زمین کس کے ہیں؟ ظاہر ہے کہ خدا ہی کے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انہیں بھی مجال انکار نہیں ہے ۔ پھر انہیں بتاؤ کہ خدا نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے جس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ تمہیں پیدا کرکے اور پرورش کے تمام اسباب فراہم کرکے یونہی شتر بے مہار بنا کے نہ چھوڑ دے بلکہ ضروری ہے کہ وہ تم سب کو کشاں کشاں روز قیامت کی طرف لے چلے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے تو آج جو لوگ اکڑتے اور اس کا مذاق اڑاتے اور اپنی دنیوی خود فراموشیوں میں مگن ہیں اس دن اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے کہ ہائے ہم نے چند روزہ عیش دنیا کی خاطر اس زندگی کو فراموش رکھا اور اپنے لیے ابدی نامرادی کا سامان کیا ۔ پھر فرمایا کہ یہ لوگ یاد رکھیں کہ شب کی تاریکیوں میں جو چیز ساکن ہوتی ہے اور دن کی روشنی میں جو چیز بھی متحرک ہوتی ہے سب خدا ہی کے اختیار، اسی کے قبضۂ قدرت اور اسی کے کنٹرول میں ہے ۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکے اور اس کے اذن کے بغیر اپنی جگہ سے سرک سکے ۔ رات کی تاریکی اور دن کی روشنی دونوں اس کے لیے یکساں ہے اور وہ ہر جگہ سے سب کو اکٹھا کرے گا اور جس طرح اس کی قدرت سب کو محیط ہے اسی طرح اس کا علم بھی ہر چیز پر حاوی ہے اس لئے کہ وہ سمیع و علیم ہے ۔ آگے یہی مضمون بڑی تفصیل کے ساتھ آیات ۵۹ - ۶۲ میں آ رہا ہے ۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؕ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ

مِنَ الْمُشْرِكِينَ ٥ قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ٥
مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ٥ (۱۴-۱۶)

'قل اغیر اللہ اتخذ ولیا فاطر السمٰوٰت والارض' یہ اس مسلّمہ حقیقت کا، جو اوپر مذکور ہوئی، دوسرا لازمی نتیجہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جب سب کچھ خدا ہی کا ہے آسمان و زمین سب کا خالق وہی ہے تو خواہ تم کتنا ہی زور لگاؤ، لیکن میرے لیے یہ کس طرح روا ہے کہ خدائے فاطر السموات والارض کے سوا کسی اور کو اپنا مولیٰ و مرجع بناؤں۔

بتوں پر ایک لطیف تعریض

'وھو یُطعِم ولا یُطعَم' یہ خدا کی ربوبیت اور پروردگاری کی طرف اشارہ بھی ہے اور مشرکین کے بتوں پر ایک نہایت لطیف تعریض بھی۔ مطلب یہ ہے کہ مولیٰ و مرجع بنائے جانے کا سزاوار تو وہ ہے جو آسمان و زمین کا عدم سے وجود میں لانے والا بھی ہے اور جس کے تفضل و کرم سے سب کو روزی بھی مل رہی ہے نہ کہ تمہارے وہ اصنام خیالی جن کے متعلق تمہیں خود یہ تسلیم ہے کہ وہ خالق و موجد کسی چیز کے بھی نہیں، رہی ان کی پروردگاری تو اس کا بھانڈا پھوڑ دینے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ان کے آگے حلوے مانڈے تم پیش کرتے ہو تب وہ راضی و آسودہ ہو سکتے ہیں۔ یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ مشرکین اپنے بتوں کے آگے جو کچھ پیش کرتے ہیں اس تصور کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یہ ان کی پسندیدہ اور مرغوب غذائیں ہیں جن کو وہ نوش کرتے اور جن کی خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے ایک خدا پرست خدا کے نام پر جو کچھ پیش کرتا ہے اس کا کوئی حصہ، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، خدا کو نہیں پہنچتا بلکہ سب کا سب خدا کے حقدار بندوں کو پہنچتا ہے۔

نبی کا عزم دوسروں سے بے نیاز ہوتا ہے

'قل انی امرت ان اکون اول من اسلم' یعنی اگر تم مدعی ہو کہ خدا نے تمہارے ان مزعومہ بتوں کو اپنی خدائی میں شریک بنایا ہے اور تمہیں ان کی عبادت کا حکم دیا ہے تو تم جانو، مجھے تو جو حکم ملا ہے وہ یہ ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا اور اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالے کر دینے والا بنوں۔ سو میں تو اسی حکم کی تعمیل کرنے والا ہوں، تم میں سے کوئی میرا ساتھ دے یا نہ دے۔ اس اسلوب بیان سے، جیسا کہ ہم دوسری جگہ تصریح کر چکے ہیں، جہاں یہ بات نکلتی ہے کہ نبی جس بات کی تعلیم دنیا کو دیتا ہے اس پر پہلا عمل کرنے والا وہ خود بنتا ہے وہیں یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس امر سے اس کی اس یکسوئی اور اس کے عزم میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا کہ جن کو اس نے پکارا ان میں سے کسی نے اس کا ساتھ دیا یا نہیں دیا۔

'ولا تکونن من المشرکین' کا عطف 'ان اکون اول من اسلم' پر نہیں

ہے بلکہ یہ مستقل بات ہے یعنی تم ان کو یہ بتا دو کہ مجھے یہ حکم ملا ہے اور تم مشرکین میں سے نہ بنو۔ اس طرح کی نہی میں اگرچہ ظاہر خطاب آنحضرت صلعم سے ہوتا ہے لیکن اس میں زجر کا جو پہلو ہوتا ہے اس کا رخ ان لوگوں کی طرف ہوتا ہے جن کا رویہ زیر بحث ہوتا ہے۔

'قل انی اخاف ان عصیت ربی الایہ' یعنی جب مجھے حکم یہ ملا ہے کہ میں سب سے پہلا اسلام لانے والا بنوں تو میرے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اپنے رب کے اس حکم کی نافرمانی کروں؟ اگر میں نافرمانی کروں تو میں اس ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں جس سے ہر نافرمانی کرنے والے کو سابقہ پیش آنا ہے۔

'من یصرف عنہ یومئذ فقد رحمہ' یعنی ڈرنے کی اصلی چیز یہ خوفناک دن اور اس کا عذاب ہی ہے، جو اس سے محفوظ رہا، درحقیقت وہی ہے جس پر خدا کا رحم ہوا اور چاہنے کی اصلی چیز یہ اس دن کی رحمت ہی ہے اس لیے کہ جو اس رحمت کا سزاوار قرار پایا درحقیقت وہی ہے جس نے اصل کامیابی حاصل کی۔ اس میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ بھی ہے کہ جو لوگ اس دنیا کی کامیابیوں ہی کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ان کے پیچھے آخرت کی 'فوز مبین' کو بھول بیٹھے ہیں انہیں اپنی بدبختی اور محرومی کا اندازہ کل ہو گا۔

ڈرنے کی اصل چیز اور چاہنے کی اصل چیز

وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۚ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ - ۱۷-۱۸

'وان یمسسک اللہ بضر' میں خطاب اگرچہ لفظاً بصیغہ واحد ہے لیکن مراد عام ہے اور بات اوپر والی بات ہی کی توضیح مزید کی حیثیت رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفع و ضرر دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ اگر وہ کسی کو کسی دکھ میں مبتلا کرے تو کوئی نہیں ہے جو اس کو دور کر سکے اسی طرح اگر وہ کسی کو کسی خیر سے بہرہ مند کرے تو جس خیر سے چاہے بہرہ مند کر دے، کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔ پھر کسی اور کو مولیٰ و مرجع بنانے اور کسی اور سے دعا و استرحام کی ضرورت کیا باقی رہی؟

نفع و ضرر صرف خدا کے اختیار میں ہے

'وھو القاھر فوق عبادہ' 'قہر' کا لفظ عربی میں اس معنی میں بالکل نہیں آتا جس معنی میں اردو میں آتا ہے بلکہ اس کے معنی اختیار اور قابو، حکومت اور تسلط میں رکھنے کے آتے ہیں۔ انگریزی میں لفظ (control) کا جو مفہوم ہے وہی مفہوم عربی میں اس لفظ کا ہے۔ اسی

سے لفظ 'قہار' مبالغہ کا صیغہ ہے جو اسمائے حسنٰی میں سے ہے جس کے معنی (controller)
کے ہیں۔ یعنی تمام جہان اور اس کے تمام بندے ہر آن اس کی مٹھی اور اس کے قابو میں ہیں۔ وہ
ان کو قابو میں رکھنے کے لئے نہ کسی مددگار کا محتاج ہے اور نہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ جب وہ ان کو
پکڑنا چاہے یا کھٹکا کرنا چاہے تو کوئی اس کی گرفت سے باہر نکل سکے۔ آگے اس مضمون کی وضاحت
بھی ہوگئی ہے۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓي
اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ۔ ۶۱
(اور وہ اپنے تمام بندوں پر اپنا قابو جمائے ہوئے ہے اور وہ تم پر اپنے نگران بھیجتا رہتا ہے۔
یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو اس کو ہمارے فرستادے ہی قبض کرتے ہیں اور
وہ اس کام میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔)

'وھو الحکیم الخبیر' خدا کا حکیم وخبیر ہونا ہم دوسرے مقامات میں واضح کرچکے ہیں کہ
کئی باتوں کو مستلزم ہے۔ مثلاً یہ کہ وہ ایک روز جزا و سزا کو لائے اس لیے کہ اس کے بغیر یہ دنیا بالکل
بے مقصد ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس کے ہاں کسی ایسی شفاعت کی گنجائش نہ ہو جو حق کو باطل اور باطل
کو حق بنا سکے اس لئے کہ یہ اس کی حکمت کے بھی منافی ہے اور اس کے خبیر ہونے کے بھی۔

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ڐ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ
وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ اَىِٕنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ
اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ۭ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ
وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۔ ۱۹

ومن بلغ کا عطف

'لانذرکم بہ ومن بلغ' عام طور پر مفسرین نے 'ومن بلغ' کو ضمیر
منصوب پر معطوف مانا ہے یعنی یہ قرآن اس لئے مجھ پر وحی کیا گیا ہے کہ میں اس کے ذریعے سے
تم کو اور ان سب کو بیدار و ہوشیار کروں جن تک یہ پہنچے۔ لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ ضمیر متکلم پر
معطوف ہے یعنی میں اس کے ذریعے سے تم کو خبردار کروں اور جن کو یہ پہنچے وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر
دوسروں کو اس کے ذریعے سے خبردار کریں۔ یہ گویا اس ذمہ داری کی یاد دہانی ہے جس کا ذکر دوسرے
مقام میں یوں ہوا ہے۔ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَاۗىِٕفَةٌ
لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ ۱۲۲-توبہ

(پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت دین کا علم حاصل کرنے کے لیے نکلتی اور تاکہ وہ اپنی قوم کو خبردار کرتی جبکہ ان کی طرف واپس آتی) یہی حقیقت احادیث میں بھی واضح کی گئی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تمام صحابہؓ پہ انذار و تبلیغ کی ذمہ داری ڈالی اور فرمایا "فلیبلغ الشاهد الغائب" پس چاہیئے کہ جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔ "لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا" میں اس امت کا جو فریضہ منصبی بیان ہوا ہے اور جس کی وضاحت ہم اس کے مقام میں کر چکے ہیں، اس سے بھی اسی مفہوم کی تائید نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔

توحید اور شرک کے معاملہ میں فیصلہ کن گواہی خدا کی ہے

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں، اس معاملے میں فیصلہ کن گواہی خود خدا ہی کی ہو سکتی ہے۔ وہی بتا سکتا ہے کہ اس نے اپنی خدائی میں کسی کو شریک بنایا ہے یا نہیں اور بنایا ہے تو وہ کون کون ہیں اور وہ کس نوعیت سے شریک ہیں۔ اگر اس نے کسی کا شریک ہونا تسلیم نہیں کیا ہے تو تم کو یا کسی کو کیا حق ہے کہ کسی کو اس کی خدائی میں حصہ دار بنالئے۔ اب آؤ میں اس نزاع کے فیصلے کے لئے اپنے اور تمہارے درمیان خدا ہی کو گواہ مانتا ہوں۔ اس نے میرے اوپر یہ قرآن اسی گواہی کے لیے نازل کیا ہے کہ میں تم کو خبردار کر دوں کہ کوئی اس کا شریک نہیں ہے اور جن جن کو یہ پہنچے وہ بھی دوسروں کو خبردار کریں کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے اب اس کے بعد بھی اگر تم مدعی ہو کہ دوسرے معبود خدا کے شریک ہیں تو میں اس بے دلیل گواہی کے لیے تیار نہیں۔ مجھے خدا کا حکم یہی ہے کہ میں اعلان کروں کہ وہ ایک ہی معبود ہے اور میں ان تمام چیزوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں جن کو تم خدا کا شریک گردانتے ہو۔

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمُ
الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ
افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ۲۰-۲۱

"الذين آتيناهم الكتاب يعرفونه كما يعرفون ابناءهم" اس ٹکڑے پر تفصیلی بحث بقرہ کی تفسیر میں آیت ۱۴۶ کے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے بتایا ہے کہ اس سے مراد صالحین اہل کتاب ہیں۔ قرآن میں اچھے اہل کتاب کا ذکر بالعموم بصیغہ معروف ہی ہوا ہے۔ "یعرفونه" میں ضمیر منصوب کا مرجع قرآن ہے جس کا ذکر اوپر "واوحی الی هذا القرآن" میں گزر چکا ہے۔ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مراد لیا گیا ہے لیکن چونکہ یہاں سیاق کلام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

خطاب کا ہے اس وجہ سے آپؐ کے لئے ضمیر غائب موزوں نہیں ہے۔ ویسے باعتبار مدعا کوئی فرق واقع نہیں ہوگا اس لیے کہ نبی اور قرآن دونوں لازم و ملزوم ہیں اور ایسے لازم و ملزوم کو قرآن میں، جیسا کہ ہم دوسرے مقام میں واضح کریں گے، ایک دوسرے سے بدل پڑے ہوئے ہیں۔ بقرہ میں ہم 'انباءھم' کی تشبیہ پر بھی بحث کر چکے ہیں کہ جس طرح ایک مہجور باپ کو اپنے موعود منتظر بیٹے کا انتظار ہوتا ہے اور جب وہ آتا ہے تو دور سے اس کے پیراہن کی خوشبو اس کے لیے نوید مسرت لاتی ہے اسی طرح صالحین اہل کتاب کو قرآن اور پیغمبرؐ کا انتظار تھا اور اسی جذبے کے ساتھ جیسا کہ 'واذا سمعوا ما انزل الی الرسول الایہ' کے تحت گزر چکا ہے، انہوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔

صالحین اہل کتاب کی گواہی

اب یہ قرآن کی گواہی کو مزید موثق کرنے کے لئے فرمایا کہ یہ کوئی غیر معروف گواہی نہیں ہے بلکہ جانی پہچانی ہوئی گواہی ہے۔ اس کا ذکر پچھلے آسمانی صحیفوں میں موجود ہے۔ تم سے پہلے جن کو کتاب عطا ہوئی وہ اس کو پہچانتے ہیں اور جو ان میں اہل ایمان ہیں وہ اس کے منتظر و مشتاق رہے ہیں۔ اس پر ایمان لانے سے محروم تو صرف وہ رہیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا۔ فرمایا جب خدا کی گواہی یہ ہے تو ان سے بڑھ کر بدقسمت، ظالم اور نامراد کون ہو سکتا ہے جو اس گواہی کے خلاف خدا پر یہ جھوٹ باندھیں کہ اس نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا ہے یا اس کی آیات کی تکذیب کریں جب کہ وہ توحید کی واضح تعلیم کے ساتھ ان کے پاس آ گئی۔ ایسے ظالم کبھی فلاح پانے والے نہیں بن سکتے۔

یہ سورہ اگرچہ مکی ہے لیکن یہ اس دور کی سورہ ہے جب مدینہ کے اہل کتاب اس دعوت سے غیر متعلق نہیں رہے تھے بلکہ ان کے احبار اس کی مخالفت کو شہ دے رہے تھے اور جو اچھے لوگ تھے وہ اس کو سابق صحیفوں کی پیشگوئیوں کی تصدیق سمجھتے تھے۔ اس وجہ سے قرآن کا یہ اشارہ یہاں بڑا معنی خیز ہے۔ اس سے احبار کی حوصلہ افزائی بھی ہوئی اور ساتھ ہی ان لوگوں پر ایک چوٹ بھی لگا دی گئی جو جان کر انجان بن رہے تھے۔ اس مضمون کی مزید تفصیل اسی سورہ میں آگے آیت ۲۱ کے تحت آئے گی۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ۝ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ۝ انْظُرْ كَيْفَ كَذَبُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ ۲۲-۲۴

جمیعاً کی تاکید کا فائدہ

'ویوم نحشرھم جمیعًا' میں 'جمیعًا' کی تاکید نے ان تمام گروہوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا۔ یعنی ان کو بھی جنہوں نے خدا پر جھوٹ گھڑ کے اس کے لیے شرکاء ایجاد کیے، ان کو بھی جنہوں نے مرنے کے بعد اٹھائے جانے اور جزا و سزا کا انکار کیا اور ان کو بھی جنہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی۔ اگرچہ یہ تمام جرائم ان تمام مشرکین کے مشترک جرائم تھے تاہم ان کے ذوقی رجحانات کچھ الگ الگ بھی تھے اس وجہ سے آگے کی آیات میں ان کا الگ الگ بھی ذکر ہوا اور ان سب پر ان کے جرائم کی مخصوص نوعیت کے اعتبار سے ضرب لگائی گئی ہے۔

فتنہ کا مفہوم

'ثم لم تکن فتنتھم' لفظ 'فتنہ' کی تحقیق دوسرے مقام میں گزر چکی ہے۔ اگر اس کو اس معنی میں لیا جائے جس معنی میں مال و اولاد، دنیا اور زخارف دنیا کو قرآن میں فتنہ کہا گیا ہے تب تو یہ اپنے مفعول کی طرف مضاف ہو گا اور مطلب یہ ہو گا کہ جس فتنۂ شرک اور جن جھوٹی اور موہوم آرزوؤں میں آج یہ مبتلا ہیں اس کے پردے اٹھ جائیں گے اور ان کو نظر آ جائے گا کہ جن سہاروں پر وہ جی رہے تھے وہ محض فریب تھے۔ اس وقت ان کو اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آئے گا کہ جس طرح آج خدا پر جھوٹ باندھ رہے ہیں اسی طرح اپنے اوپر جھوٹ بولیں۔ اور اگر اس لفظ کو ظلم و تشدد سے دین سے پھیرنے کے معنی میں لیا جائے تو یہ اپنے فاعل کی طرف مضاف ہو گا اور مطلب یہ ہو گا کہ آج جس فتنہ میں یہ کمزور مسلمانوں کو بجرم انکارِ شرک' مبتلا کر رہے ہیں وہ ختم ہو جائے گا، اور وہ خود ایسی آفتوں میں مبتلا ہو جائیں گے کہ آج جس شرک کی حمایت میں وہ مسلمانوں کو مظالم کا ہدف بنائے ہوئے ہیں خدا کی پکڑ میں آتے ہی اس سے برأت کا اعلان کریں گے اور جھوٹ بولیں گے۔ ان دونوں میں سے جو مفہوم بھی لیا جائے دونوں ہی صورتوں میں اندازِ کلام طنزیہ ہو گا اور استثنا منقطع۔ میرا غالب رجحان پہلے مفہوم کی طرف ہے اور ترجمہ میں اسی کا میں نے لحاظ رکھا ہے۔

مشرکین کا جھوٹ دنیا اور آخرت میں

'انظر کیف کذبوا علیٰ انفسھم' میں 'انظر' تصویرِ حال کے لیے ہے تاکہ مستقبل کا ایک ماجرا چشمِ تصور کے سامنے آ جائے۔ 'کذبوا علیٰ انفسھم' کے معنی ہیں، 'انہوں نے اپنے اوپر جھوٹی گواہی دی'، یعنی دنیا میں جس شرک کی حمایت میں لڑتے مرتے رہے آخرت میں پہلے ہی قدم پر، قسم کھا کر اس کا انکار کریں گے۔ اس میں یہ لطیف تعریض بھی ہے کہ دنیا میں یہ خدا کے خلاف جھوٹی گواہی دیتے رہے، جیسا کہ آیت ۱۹ میں مذکور ہے؛ اور آخرت میں اپنے اوپر جھوٹی گواہی دیں گے۔ 'ضل عنھم ما کانوا یفترون' کا ٹھیک ٹھیک مطلب یہ ہو گا کہ دنیا میں خدا پر جھوٹ باندھ کر جن کو شرکا و شفعا کا درجہ دیا گیا تھا اور جن سے تمام امیدیں باندھی گئی

تھیں وہ سب ہوا ہو گئے۔ ان میں سے کوئی کام نہ آیا۔

ایک سوال کا جواب

اجزا کی تشریح سے آیات کا مدعا خود بخود واضح ہو گیا ہے، مزید تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ البتہ ایک سوال ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو۔ وہ یہ کہ قرآن کے بعض مقامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز مشرکین اپنے شرک کا اقرار کریں گے بلکہ اپنے شرکا کو پکاریں گے بھی اور آیت زیر بحث میں یہ تصریح ہے کہ وہ قسم کھا کے شرک سے اپنی برأت کا اعلان کریں گے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ احوال روز قیامت کے مختلف مراحل کے بیان ہوئے ہیں۔ اس روز مشرکین کو جس حیرانی و پریشانی سے سابقہ پیش آئے گا وہ ایسی ہو گی کہ اس میں ان کو نجات کی کوئی راہ سجھائی نہیں دے گی اس وجہ سے جس مرحلے میں جو بات بنتی نظر آئے گی وہ بنانے کی کوشش کریں گے لیکن ع

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءُوْكَ يُجَادِلُوْنَكَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْــــَٔـوْنَ عَنْهُ ۚ وَاِنْ يُّهْلِكُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَي النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۔ ۲۵-۲۸

ایک سنت الٰہی کا بیان

'وجعلنا علی قلوبہم اکنۃ ان یفقہوہ وفی اذانہم وقرا' 'اکنۃ' 'کن' اور 'کنان' کی جمع ہے۔ اس کے معنی پردہ اور ڈھکنے کے ہیں۔ 'وقر' بوجھ، ثقل اور گرانی کو کہتے ہیں اور یہاں اس سے وہ گرانی مراد ہے جو کانوں کو بہرہ کر دے۔ یہاں جس حجاب اور جس بہرے پن کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ معنوی اور روحانی حجاب اور گرانی ہے جو دلوں اور کانوں کو سننے اور سمجھنے کی اس صلاحیت سے محروم کر دے جو انسانیت کا اصلی خاصہ ہے اور جس سے محروم ہو کر انسان چوپایہ بلکہ چوپائے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ انسان پر یہ محرومی اس کی اپنی شامتِ اعمال کے نتیجہ میں مسلّط ہوتی ہے جس کا ایک مخصوص ضابطہ ہے۔ اس ضابطہ یا بالفاظِ دیگر اس سنت اللہ کی پوری تفصیل ہم بقرہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

چونکہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی ٹھہرائی ہوئی ایک خاص سنت کے تحت واقع ہوتی ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف منسوب فرماتا ہے۔ بقرہ میں ختم قلوب کی بحث پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ اس آیت میں 'ان یفقھوہ' کا مقابل فعل جو لفظ 'آذان' کے ساتھ مناسبت رکھنے والا ہو، محذوف ہے۔ ترجمہ میں ہم نے اس کو کھول دیا ہے

'وان یروا کل ایۃ لا یؤمنوا بھا' یہ محض مبالغہ کا ایک اسلوب بیان نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے عجائب اور کرشمے ظاہر نہیں ہوئے۔ آخر یہ ساری کائنات، آسمان و زمین، سورج، چاند، دریا، پہاڑ، ابر ہوا، رات، دن کیا ہیں؟ کیا یہ کرشمے اور عجائب نہیں ہیں؟ ساری کائنات کرشموں اور عجائب سے بھری پڑی ہے لیکن جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہی نہ ہوں، ان کا کیا علاج؟ جس طرح ان سارے عجائب اور کرشموں سے ان کی آنکھیں بند ہیں اگر اور کرشمے بھی ان کو دکھا دیئے جائیں جب بھی یہ کوئی نہ کوئی بات جا ہی لیں گے اور اپنی ہٹ پر جمے ہی رہیں گے۔ ان کا علاج تو یہ ہے کہ یہ اپنی آنکھوں کی پٹیاں کھولیں اور گوش دل سے پیغمبر کی باتیں اور قرآن کی دعوت سنیں۔ یہ وہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو معجزوں اور کرشموں سے ان کو کیا نفع پہنچے گا؟

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

'ان ھذا الا اساطیر الاولین' 'اساطیر' 'سطر' کے مادے سے 'اسطورۃ' اور 'اسطیرۃ' کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں بے سروپا داستان، بے اصل قصہ، فسانہ۔

ایک حقیقت نفس الامری

قرآن نے اپنی دعوت کے سلسلہ میں بعض قوموں کی تاریخ جو پیش کی ہے وہ اس پہلو سے پیش کی ہے جو تاریخ کا اصلی فائدہ ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قوموں کا ابھرنا اور فنا ہونا اتفاقی واقعات کے طور پر ظہور میں نہیں آتا بلکہ اس میں اصلی دخل اخلاقی عوامل کو ہوتا ہے۔ جب کوئی قوم زندگی کے اخلاقی عناصر سے خالی ہو جاتی ہے تو قدرت کا قانون اس کو فنا کر دیتا ہے اور کوئی دوسری قوم اس کی جگہ اٹھا کھڑی کرتا ہے جو کردار و اخلاق میں اس سے بہتر ہوتی ہے اور پھر اس کی آزمائش کرتا ہے کہ وہ اقتدار پا کر کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔ اگر اس کا رویہ بھی بگڑ جاتا ہے تو پھر اس کو بھی فنا کر دیتا ہے اور اس کی جگہ کسی دوسری قوم کو لاتا ہے۔

قوموں کے عروج و زوال سے متعلق عربوں کا نظریہ

عروج و زوال کے اس اصول کو بنیاد قرار دے کر قرآن نے عربوں کے سامنے خود ان کے ملک اور ان کے گرد و پیش کی تاریخ رکھی کہ عاد، ثمود، مدین، سبا، قوم لوط اور قوم فرعون وغیرہ کے فنا ہونے کے واقعات اتفاقی واقعات نہیں ہیں بلکہ یہ عروج و زوال کے اس خدائی ضابطے کے تحت ظہور میں آئے ہیں جو قوموں کی زندگی اور موت کے لیے خدا نے مقرر فرمائے ہیں۔ یہ قومیں اخلاقی و روحانی بیماریوں میں

مبتلا ہوئیں تو اللہ نے ان کی اصلاح اور ان کے علاج کے لیے روحانی و اخلاقی طبیب یعنی انبیا بھیجے۔ ان انبیاء نے سر توڑ کوشش کی کہ اپنی قوم کی بیماریاں دور کریں لیکن ان کی قوموں نے ان کی باتوں پہ کان نہ دھرے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو فنا کر دیا۔ یہ تاریخ سنا کر قرآن نے عربوں کو متنبہ کیا کہ اس وقت تمہارے سامنے بھی زندگی اور موت کا یہی مرحلہ ہے۔ تمہارے اندر بھی خدا کا رسول آگیا ہے اور اگر تم نے اس کی بات نہ سنی تو تم بھی اسی طرح فنا کر دیئے جاؤ گے جس طرح تمہاری پیشرو قومیں فنا کر دی گئیں۔ اہل عرب کے پندار پر قرآن کے اس انذار سے سخت چوٹ پڑتی تھی۔ اوّل تو ان پہ یہی بات شاق گزرتی تھی کہ وہ کسی اخلاقی و ایمانی بیماری میں مبتلا ہیں جس کے نتیجے میں ان پہ عذاب الٰہی آنے والا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اس بات کو بالکل بعید از عقل سمجھتے تھے کہ قومی عروج و زوال میں اخلاقی عوامل کو کوئی دخل ہوتا ہے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ قومیں بھی افراد و اشیا کی طرح جنتی اور مرتی ہیں، جس طرح ایک فرد یا ایک درخت پیدا ہوتا ہے، جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے پھر مر جاتا یا سوکھ جاتا ہے اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی، جوان ہوتی اور فنا ہو جاتی ہیں۔ اس پیمانہ کو کردار و ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اہل عرب کا یہ قول جو قرآن میں نقل ہوا ہے کہ 'وما یھلکنا الا الدھر' (ہمیں نہیں تباہ کرتی مگر گردش روزگار) وہ بھی قرآن اور پیغمبر کے اسی انذار کے جواب میں کہتے تھے کہ یہ غلط ہے کہ قومیں اخلاق و ایمان کی بنا پہ تباہ ہوتی ہیں، ایمان و اخلاق کو اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب گردش روزگار کے کرشمے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ان کا نظریہ یہ تھا تو قرآن کے اس تاریخی نقطۂ نظر پہ ان کو غصّہ آنا ہی تھا اور ان کا یہ غصّہ اور بھی بڑھ جاتا تھا جب وہ یہ دیکھتے کہ بہت سے لوگ اس تاریخی حقیقت سے اثر پذیر ہو کر یہ اندیشہ بھی کرنے لگے ہیں کہ اگر انہوں نے پیغمبرؐ اور قرآن کی بات نہ مانی تو وہ عذاب کی گرفت میں آجائیں گے۔ اس بوکھلاہٹ میں وہ یہ کہتے کہ 'ان ھذا الا اساطیر الاوّلین' یہ قرآن ہے کیا، بس اس میں پچھلی قوموں کے کچھ بے سروپا افسانے ہیں جن کو نعوذ باللہ ایک سر پھرا سناتا پھر رہا ہے۔ اس پر نحل کی آیت ۲۴ کے تحت مزید بحث آئے گی۔

'فقالوا یا لیتنا نرد ولا نکذب بآیات ربّنا'۔ یہاں تمنّی کا جواب 'فنصدّق' یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ محذوف ہے اور 'ولا نکذب' اسی محذوف پہ معطوف ہے اس وجہ سے مضارع خفیف کی شکل میں آیا ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں اس سے پہلے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی، مثالیں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ مذکورہ بالا تمنا کے جواب میں 'فنصدق' یا اس کے ہم معنی کسی لفظ کا آنا بالکل واضح تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا اور 'ولا نکذب' میں جو حرف عطف ہے اس کے ذریعہ سے محذوف کا پتا

دے دیا۔ 'ولا نکذب' کے اظہار میں جو بلاغت ہے وہ یہ ہے کہ اس سے ان کی حسرت کا بھی اظہار ہو رہا ہے اور اعتراف جرم کا بھی۔ یعنی آج تو یہ اکڑ رہے ہیں اور قرآن کو ایک داستان پارینہ قرار دے رہے ہیں لیکن کل حسرت کریں گے کہ کاش ہم پھر دنیا میں جائیں کہ اپنے رب کی آیات کی تصدیق کریں اور انکی تکذیب نہ کریں۔

اجزائے کلام کی وضاحت کے بعد ایک اجمالی نظر ان آیات پر پھر ڈال لیجئے۔

قرآن کی تکذیب کرنے والے سرہنگوں کا انجام

اوپر آیات ۲۱۔۲۴ میں شرک کے سرغنوں کا انجام واضح کیا گیا تھا، زیر بحث آیات میں قرآن کی تکذیب کرنے والے سرہنگوں کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ ان کے کچھ اشرار تمہاری باتیں اور تمہارا پیش کردہ کلام سنتے تو ہیں لیکن سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے نہیں بلکہ بحث و جدال کے لئے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس کو بہانہ بنا کر تم سے کٹ حجتی کر سکیں۔ ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر انکی بداعمالیوں کے سبب سے مہر ہو چکی ہے اس وجہ سے اب یہ اسکو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نہ خیال کرو کہ انکی طلب کے مطابق اگر انکو معجزہ دکھا دیا جائے تو اسکو مان لیں گے اور پھر اس قرآن پر ایمان لائیں گے نہیں، اگر یہ دنیا جہان کے معجزے بھی دیکھ لیں گے جب بھی یہ اسی طرح کٹ حجتی کریں گے اس لئے کہ ان کے انکار اور انکی تکذیب کی اصل علت جب بھی باقی رہیگی۔ انکے اندر بات کے سننے اور سمجھنے کا کوئی ارادہ ہی موجود نہیں ہے۔ چنانچہ سب کچھ سن کر تمہارے پاس جھگڑنے کیلئے آستینیں چڑھائے ہوئے آتے ہیں اور کہتے ہیں اس قرآن میں رکھا ہی کیا ہے، اگلوں کی داستانیں اور پچھلوں کے فسانے!! فرمایا کہ اسطرح یہ دوسروں کو بھی اس سے روک رہے ہیں اور خود بھی اس سے متکبرانہ اعراض کر رہے ہیں لیکن اطمینان رکھو، نہ یہ خدا کا کچھ بگاڑ رہے ہیں نہ تمہارا، بلکہ یہ اپنے آپ ہی کو ہلاکت کے گڑھے میں جھونک رہے ہیں لیکن ابھی چونکہ وہ انجام انکے سامنے نہیں آیا ہے جس سے انکو خبردار کیا جا رہا ہے اس وجہ سے انکو اسکا احساس نہیں ہے۔ اگر تم اسوقت کو دیکھ پاتے جب یہ اپنے انجام سے دوچار ہوں گے تو دیکھتے کہ جب یہ دوزخ کے کنارے پر کھڑے کئے جائیں گے تو کہیں گے اے کاش ہم پھر دنیا میں لوٹائے جائیں کہ قرآن کی تصدیق کریں اور اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں اور اہل ایمان میں سے بنیں۔ فرمایا کہ وہ اپنے اس اعتراف میں بھی جھوٹے ہیں۔ اگر وہ پھر لوٹائے جائیں تو وہی کریں گے جس سے وہ روکے گئے ہیں اسلئے کہ انکی تکذیب کی علت یہ نہیں تھی کہ اصل حقیقت ان پر واضح نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ پیغمبر سچا ہے، قرآن حق ہے، جزا و سزا شدنی ہے لیکن حب دنیا، غرور اور حسد کے حجابات نے انکی آنکھیں کھلنے نہ دیں۔ اب اگر دنیا میں جائینگے تو جسطرح دل کی شہادت کے خلاف پہلے حق کو جھٹلاتے رہے ہیں اسی طرح پھر اس کو جھٹلائیں گے اور اس مشاہدے کو بھی زیادہ سے زیادہ ایک ڈراؤنا خواب قرار دے لیں گے۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰي رَبِّهِمْ ۭ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰي وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ

بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰي مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰي ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ۝ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

قیامت کو جھٹلانے والوں کا انجام

ان آیات میں کوئی ادبی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ مکذبین قرآن کے بعد اب یہ مکذبین قیامت کا انجام بیان کیا جا رہا ہے جو اس دنیا کی زندگی ہی کو زندگی سمجھتے تھے اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کے یا تو قائل ہی نہ تھے یا اس کو بہت ہی بعید از قیاس و امکان چیز سمجھتے تھے۔ فرمایا کہ اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے تو دیکھتے کہ ایک دن یہ سب اپنے رب کے حضور لا کھڑے کئے جائیں گے اور ان سے سوال ہوگا کہ کیوں یہ دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اور قیامت کا آنا ایک امر واقعہ ثابت ہوا یا نہیں؟ اس وقت وہ کہیں گے ہاں ہمارے رب کی قسم! یہ تو ایک امر واقعہ ہے۔ حکم ہوگا کہ پھر اب اس دن کے انکار کی پاداش میں چکھو مزا عذاب کا۔ اس کے بعد مکذبین کو تنبیہ کے ساتھ اہل ایمان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ جن شامت زدوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا وہ سخت گھاٹے میں پڑے، جب قیامت کی گھڑی اچانک آدھمکے گی تو یہ حسرت سے اپنے سر پیٹیں گے اور کہیں گے ہم نے دنیا کی زندگی پر بھروسہ کر اس دن کی تیاریوں میں جو کوتاہی کی اس پر افسوس! فرمایا کہ اس دن ان کی تصویر یہ ہوگی کہ سب اپنے اپنے گناہوں کے بوجھ اپنی اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوں گے، نہ ان کے ساتھ ان کے اعوان و انصار ہوں گے، نہ نشر کا و شفعاء نفسی نفسی کا عالم۔ لا تزر وازرۃ وزر اخری (کوئی جان بھی کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہ بنے گی) پھر آگاہی دیتے ہوئے فرمایا کہ کیا ہی برا ہوگا وہ بوجھ جس کو یہ اٹھائے ہوئے ہوں گے اس لئے کہ یہ بوجھ ان کے سروں سے پھر کبھی اترنے والا نہیں۔ اس کے بعد آخرت سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرنے والوں کے لئے تسلی کا پہلو اور زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ فرمایا کہ یہ دنیا کی زندگی جس نے انہیں آخرت سے غافل کر دیا ہے کیا؟ محض بے نتیجہ لہو و لعب، چند روزہ دل کا بہلاوا! اصل شے تو دار آخرت اور اس کی زندگی ہے جو آخرت سے ڈرنے والوں کے لیے اس دنیا کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ پس کیا تم سمجھتے نہیں؟

مطالعہ حدیث

مولانا عبد الحفیظ حسن
استاذ حدیث، جامع مدینہ منورہ

اسلام میں اسناد کی اہمیت

(۲)

آثار صحابہ میں سند کی اہمیت

(۱) عن عبد اللہ بن مسعود قال ان الشیطان لیتمثل فی صورۃ الانسان فیاتی القوم فیحدثھم بالحدیث من الکذب فیتفرقون، فیقول الرجل منھم سمعت رجلا اعرف وجھہ ولا ادری ما اسمہ یحدث، مقدمہ صحیح مسلم ج ۱ ص ۷

عبد اللہ بن مسعود نے فرمایا کہ شیطان انسان کی شکل اختیار کرکے لوگوں کے پاس آتا ہے اور ان کو جھوٹی سچی باتیں سناتا ہے پھر لوگ منتشر ہوجاتے ان میں سے ایک کہتا ہے کہ میں نے ایک آدمی کو فلاں بات کرتے ہوئے سنا ہے۔ میں اس کی صورت پہچانتا ہوں لیکن اس کے نام سے واقف نہیں ہوں۔

کسی راوی کی بات پر یقین اعتماد کرنے کے لیے اس کی شخصیت سے پوری طرح واقفیت ضروری ہے، محض صورت شناسی کافی نہیں ہے۔ جب عام بات چیت کے سلسلے میں حضرت عبد اللہ بن مسعود تنبیہ فرما رہے ہیں تو حدیث نبوی میں تو بدرجہ اولی احتیاط کی ضرورت ہے۔

(۲) عن مجاھد قال جاء بشیر العدوی الی ابن عباس فجعل یحدث ویقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فجعل ابن عباس لا یاذن لحدیثہ ولا ینظر الیہ فقال یا ابن عباس مالی لا اراک تسمع لحدیثی، احدثک عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ

مجاہد سے روایت ہے کہ بشیر عدوی حضرت عبد اللہ بن مسعود کی خدمت میں حاضر ہوئے اور لگے حدیثیں بیان کرنے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا، اور یہ فرمایا لیکن حضرت ابن عباس کا یہ حال تھا کہ نہ ان کی بات پر کان دھرا اور نہ نگاہ اٹھا کر دیکھا، آخر کار بشیر نے کہا کیا معاملہ ہے آپ میری بات نہیں سنتے میں آپ سے حدیث رسول اللہ

وسلم ولا تسمع فقال ابن عباس انا كنا اذا سمعنا رجلا يقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ابتدرته ابصارنا واصغينا اليه باٰذاننا فلما ركب الناس الصعب والذلول لم ناخذ من الناس الا ما نعرف مقدمہ صحیح مسلم مع النووی طبع مصر ج ۱ صلہ

صلی اللہ علیہ وسلم بیان کرتا ہوں اور آپ توجہ نہیں دیتے حضرت ابن عباس نے فرمایا، ہمارا یہ حال تھا کہ جب ہم کسی کو یہ کہتے ہوئے سنتے "قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" تو ہماری نگاہیں اس کی طرف فوراً اٹھ جاتیں اور کان اس کی طرف لگ جاتے لیکن جب لوگوں نے رطب و یابس بیان کرنا شروع کر دیا تو ہم وہی روایت قبول کرتے ہیں جس کو ہم جانتے (کہ یہ حدیث نبوی ہے)۔

(۳) قال ابوذر لو وضعتم الصمصمة على هذه واشار الى قفاه ثم ظننت اني انفذ كلمة سمعتها من النبي صلى الله عليه وسلم قبل ان تجيزوا على لأنفذتها۔

حضرت ابوذرؓ نے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر اس پر تلوار رکھ دو اور مجھے یہ اندازہ ہو کہ تمہاری تلوار چلانے سے پہلے میں ایک کلمہ بھی زبان پر لا سکتا ہوں جس کو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے تو میں ضرور اسے لوگوں کو سنا کر رہوں گا۔

صحابہ کرام کا یہی شوق و ذوق تھا اور یہی جرأت و ہمت تھی جس کی بنا پر احادیث نبویہ کا ذخیرہ محفوظ طریقہ سے ہم تک پہنچ سکا۔

(۴) مشہور تابعی عطاء بن ابی رباح بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مشہور جلیل القدر صحابی ابو ایوب انصاری، عقبہ بن عامر کے پاس تشریف لے گئے (یہ مدینہ سے مصر کا سفر صرف ایک حدیث سننے کے لیے تھا)

جب ابو ایوب انصاری مصر کے امیر مسلمہ بن مخلد کے مکان پر پہنچے تو اطلاع ملنے پر مسلمہ فوراً باہر آئے اور گلے ملے دریافت کیا، کیسے یہ سفر فرمایا؟ ابو ایوبؓ نے فرمایا، ایک حدیث میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی اب اس کے سننے والوں میں سے میرے اور عقبہ کے سوا اور کوئی باقی نہیں رہا ہے۔ آپ میرے ساتھ کسی کو بھیجد دیجئے جو عقبہ کا مکان مجھے

تلاڈے۔ جب ابو ایوب، عقبہ کے پاس پہنچے تو وہ فوراً باہر تشریف لائے، معانقہ کیا اور اس سفر کی زحمت گوارہ کرنے کی وجہ دریافت کی۔ حضرت ابو ایوب نے فرمایا "ستر المومن" کے بارے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست حدیث سننے والا میرے اور آپ کے سوا کوئی باقی نہیں رہا ہے حضرت عقبہ بن عامرؓ نے فرمایا جی ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے۔ من ستر مومنا فی الدنیا علی خزیۃ ستره اللہ یوم القیامۃ، " جس نے کسی مومن کے شرمناک عمل پر پردہ پوشی کی تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے عیوب پر پردہ ڈال دے گا۔

یہ روایت سننے کے بعد ابو ایوب نے فرمایا " صدقت" عقبہ! آپ نے سچ فرمایا۔ اس کے بعد ابو ایوب اپنی سواری کی طرف پلٹے اور مدینہ منورہ واپسی کے لئے اس پہ سوار ہو گئے۔ امیر مصر کا عطیہ ان کو اس وقت ملا جبکہ وہ مصر کی سرحد پہ پہنچ چکے تھے۔

معرفۃ علوم الحدیث للحاکم ص۸۔

حضرت ابو ایوب نے مدینہ منورہ سے مصر تک کا طول طویل سفر صرف ایک حدیث کی خاطر کیا تاکہ اس کے الفاظ میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہ جائے۔ حضرت ابو ایوب چاہتے تو ان الفاظ کی تصدیق مدینہ منورہ ہی میں صحابہ کرامؓ کے شاگردوں سے معلوم کر سکتے تھے لیکن انہوں نے ضروری سمجھا کہ براہ راست عقبہ سے معلوم کریں، انہوں نے بلا واسطہ یہ حدیث آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی۔

محدثین کرام نے اس حدیث سے سند عالی (جس میں نسبتاً واسطے کم ہوں) کی اہمیت پر استدلال کیا ہے یہ اس لئے کہ جس قدر واسطے کم ہوں گے اسی لحاظ سے غلطی کا امکان کم سے کم ہوگا۔

۵۔ ابن عقیل سے روایت ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہ طلب حدیث کے لئے اپنے سفر کا قصہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے اونٹ خریدا اور ایک ماہ کا سفر طے کرکے ملک شام میں عبداللہ بن انیس کے مکان پہ پہنچا۔ قاصد کے ذریعہ اندر اطلاع کرائی گئی۔ وہاں سے سوال کیا گیا کہ جابر بن عبد اللہ تشریف لائے ہیں؟ میں نے جواب اثبات میں دیا تو فوراً عبد اللہ بن انیس باہر تشریف لائے اور مجھے گلے لگا لیا، میں نے ان سے کہا، مجھے ایک حدیث کا علم ہوا ہے جسے براہ راست میں نے آپ سے نہیں سنا ہے، مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں ہم دونوں میں سے کسی کو موت کا پیغام نہ جائے اس لیے میں نے سفر میں جلدی کی، عبد اللہ بن انیس نے فرمایا:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے"۔

یحشر اللہ العباد أو الناس عراة، غرلاً بہما قلنا ما بہما؛ قال لیس معہم شئ فینادیہم بصوت یسمعہ من بُعد أحسبہ قال۔ کما یسمعہ من قرب انا الملک لا ینبغی لاحد من اھل الجنۃ یدخل الجنۃ واحد من اھل النار یطلبہ بمظلمۃ ولا ینبغی لاحد من اھل النار یدخل النار واحد من اھل الجنۃ یطلبہ بمظلمۃ قلت وکیف؟ وانا نأتی اللہ عراة بہما قال بالحسنات والسیئات

جامع بیان العلم وفضلہ ص۹۳ ج
الادب المفرد للبخاری ص۳۳۳

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کو جمع کرے گا اس حال میں کہ وہ برہنہ بدن، بے ختنہ اور بے سرو سامان ہوں گے، ہم نے پوچھا بہماکے معنی کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا "ایسے اشخاص جن کے پاس کچھ نہ ہو پھر اللہ تعالیٰ ان کو پکارے گا ایسی آواز جس کو دور والے بھی سنیں گے، راوی کا بیان ہے کہ میرا گمان ہے کہ آپؐ نے اس کے بعد فرمایا، جیسے قریب والے (اللہ تعالیٰ فرمائے گا) میں ہی بادشاہ ہوں، کوئی جنتی، جنت میں داخل نہ ہوگا اس حال میں کہ کوئی دوزخی ظلم کی بنا پر اس سے (قصاص) کا مطالبہ کر رہا ہو، اور کوئی دوزخی دوزخ میں داخل نہ ہوگا اس حال میں کہ کوئی جنتی اس سے ظلم کی وجہ سے بدلہ کا تقاضا کر رہا ہو۔" میں نے کہا ہم تو خدا کے حضور برہنہ بدن، بے سرو سامان حاضر ہوں گے۔ تو کیسے ظلم کا مداوا ممکن ہوگا، آپؐ نے فرمایا، نیکیوں اور برائیوں کے ذریعے، یعنی ظالم کی نیکیاں چھین کر مظلوم کو دلوا دی جائیں گی اور اگر نیکیاں ختم ہو جائیں گی تو مظلوم کی برائیاں ظالم کے سر تھوپ دی جائیں گی، جیسا کہ دوسری حدیث میں اس کی وضاحت ہے۔

۴۔ بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اگر صحابۂ کرامؓ کے نزدیک سند کی کوئی اہمیت نہ
۵۔ ہوتی تو صرف ایک حدیث کی خاطر اتنا لمبا دشوار گزار سفر اختیار نہ کرتے۔ (باقی آئندہ)

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست
اقبالؒ

مولانا امین احسن اصلاحی

اسلامی حکومت میں جمہور کی حیثیت

—— : زیر طبع تالیف "اسلامی ریاست" کے ایک باب سے : ——

ایک لادینی جمہوری ریاست میں حاکمیت و اختیار کے مالک جمہور ہوتے ہیں مگر اسلامی ریاست میں، جیسا کہ واضح ہوا، حاکمیت اللہ کی ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست کوئی قومی جمہوری ریاست نہیں ہے جس میں ملک کا ہر باشندہ حاکمیت میں حصہ دار سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ وہ ایک اصولی ریاست ہے جس میں ریاست کی تشکیل اور اس کے چلانے کی تمام ذمہ داریاں ان لوگوں پر عاید ہوتی ہیں جو اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اسلامی ضابطۂ حیات کے پابند ہوتے ہیں۔ ان جمہور مسلمین کو بھی حاکمیت حاصل نہیں ہے بلکہ ان کو خدا کی شریعت کی تنفیذ کرنے اور اس مقصد کے لئے خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود اور اس کے ٹھہرائے ہوئے ضابطوں کے اندر ایک سیاسی نظام کی تشکیل کا حق حاصل ہے۔ اس سے زیادہ انہیں کسی بات کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔ نہ اپنے جی سے وہ خدا کے قانون سے بے نیاز ہو کر کوئی قانون بنا سکتے اور نہ ان چاروں گوشوں سے الگ ہو کر جو خدا اور اس کے رسول نے در کر دیئے ہیں، کوئی نظام سیاسی بنا سکتے۔ اگر وہ ایسا کریں تو یہ خدا سے بغاوت کے ہم معنی ہے۔ جمہور مسلمین کی اصلی حیثیت شرعی و قانونی یہ ہے کہ یہ "عباد اللہ" یعنی خدا کے غلام ہیں۔ ان کو خدا نے یہ اختیار دیا ہے کہ تم میری غلامی کے فرائض ادا کرنے کے لئے اپنے اندر فلاں قسم کا ایک نظام قائم کر لو۔ اور اس نظام کو چلانے کے لئے اپنے اندر سے ایک ایسے غلام کو اپنا سربراہ کار بنا لو جو میری اطاعت میں تم سب سے زیادہ سرگرم رہنے والا ہو۔ اسلام میں حاکمیت کا مرکز و مرجع بہرحال اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ رہی یہ بات کہ اس نے بندوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس کی اطاعت کریں اور چاہیں تو اس کی اطاعت نہ کریں تو اس میں شبہ نہیں کہ خدا نے اپنی تشریعی حکومت اختیار پر قائم فرمائی ہے، جبر پر نہیں قائم کی ہے۔ لیکن یہ اختیار دینے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ خدا نے حاکمیت انسانوں کے سپرد کر دی ہے۔ اگر حاکمیت انسانوں کے سپرد کر دی گئی ہوتی تو خداوند تعالیٰ انسانوں کے ان تصرفات کو ظلم، بغاوت، طغیان اور فساد سے کیوں تعبیر فرماتا جو تصرفات وہ اس کی شریعت

سے منحرف ہو کر کرتے ہیں۔ پھر تو انسانوں کا ہر تصرف جائز اور برحق ہونا چاہیئے اس لئے کہ وہ اپنی حاکمیت کے استعمال کے حقدار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کا اختیار دینا اور چیز ہے۔ اور کسی چیز کا حق حاصل ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ اسلامی نظام میں جمہور مسلمین کو قانون سازی کے کام میں سرے سے کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ یہ گمان ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام میں قانون کے مآخذ کتاب اور سنت ہی ہیں۔ جن چیزوں کے بارے میں کتاب وسنت کے اندر صریح احکام موجود ہیں ان میں مسلمانوں کے ارباب حل وعقد اور ان کے اولوالامر کا منصب صرف ان قوانین کے اجرا و نفاذ تک محدود ہے۔ وہ ان قوانین و احکام کے اندر نہ کسی ترمیم و تنسیخ کے مجاز ہیں اور نہ ان کی جگہ دوسرے قوانین بنانے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن جن معاملات میں کتاب وسنت میں سکوت اختیار کیا گیا ہے ان میں امت کو قانون سازی کا پورا پورا حق دیا گیا ہے۔ یہ حق کوئی محدود حق نہیں ہے بلکہ یہ نہایت وسیع دائرے کے اندر استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ قرآن وحدیث کے اندر بیشتر صرف بنیادی اور اصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں۔ جزئیات و تفصیلات سے نہ ان میں زیادہ تعرض کیا گیا ہے اور نہ جزئیات و تفصیلات کا احاطہ ممکن ہی ہے۔ اس خلا کو حالات و ضروریات کے تقاضوں کے تحت بھرنا، نیز تمام پیش آنے والے اجتماعی و سیاسی معاملات میں اسلام کے منشا و مزاج کے مطابق قوانین بنانا امت کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے اور اس کے لئے ایک مکمل شورائی نظام خود کتاب وسنت کے اندر تجویز کیا گیا ہے جو مغربی جمہوریتوں کے نظام قانون سازی سے بدرجہا بہتر ہے۔

یہاں ہمارے لئے اس نظام کی تمام تفصیلات سے بحث کرنے کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن دور رسالت، دور صحابہ اور دور فقہا میں جس شکل میں یہ نظام قائم رہا ہے ہم اجمالی طور پر اس کا خاکہ یہاں پیش کرتے ہیں اور اس کی تائید میں کتاب وسنت کے جو نصوص ابتدا سے اب تک مسلمان اہل فکر کی رہنمائی کرتے رہے ہیں، ضمناً ہم ان میں سے بھی چند ایک کی طرف اشارہ کریں گے۔

دور رسالت میں شورائی نظام قانون سازی کی تاسیس

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ براہ راست وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل تھی اور آپ کسی معاملہ میں دوسروں سے مشورہ لینے کے محتاج نہ تھے لیکن شورائی نظام قانون سازی اور تدبیر مملکت کے نقطہ نظر سے چونکہ ضروری تھا اس وجہ سے حکمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے طرز عمل سے اس کی بنیاد رکھیں۔ اس وجہ سے آپ کو قرآن میں یہ حکم دیا گیا :-

فاعف عنہم واستغفر لہم وشاورھم　　پس ان سے درگزر کرو اور ان کے لئے اللہ سے مغفرت

فی الامر　(شوریٰ۔ ۳۸)　　چاہو اور ان سے معاملات میں مشورہ لیتے رہو۔

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ رضی اللہ عنہم سے معاملات میں مشورہ لیتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم محض صحابہ رضؓ کی دلداری یا حوصلہ افزائی ہی کے لئے تھا یا اس کی کوئی قانونی اہمیت بھی تھی جس کے سبب سے ایسا کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ضروری تھا؟ اس سوال کا جواب فقہ حنفی کے مشہور ماہر حجۃ الاسلام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۷۰ھ) نے اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا ہے:۔

وغیر جائز ان یکون الامر بالمشاورۃ علی جہۃ تطییب نفوسہم ورفع اقدارہم ولتقتدی الامۃ بہ فی مثلہ لانہ لوکان معلوما عندہم انہم اذا استفرغوا مجہودہم فی استنباط ما شوروا فیہ وصواب الرای فیما سئلوا عنہ ثم لم یکن ذالک معمولا علیہ ولا متلقی منہ بالقبول بوجہ لم یکن فی ذالک تطییب نفوسہم ولا رفع اقدارہم بل فیہ ایحاشہم واعلامہم بان آراءہم غیر مقبولۃ ولا معول علیہا

(احکام القرآن۔ ابوبکر جصاص ج ۲ صہ ۴۹ مطبوعہ مصر ۱۳۴۷ھ)

اور یہ بات ناجائز ہے کہ صحابہ رضؓ سے مشورہ کرنے کا یہ حکم محض صحابہ کی دلداری اور ان کی عزت افزائی کے خیال سے دیا گیا ہو۔ یا محض اس خیال سے دیا گیا ہو کہ اس طرح کے معاملات میں امت کو آپ کے اس طریقے کی اقتدا کرنے کی تعلیم دی جائے کیونکہ صحابہ کو اگر یہ علم ہوتا کہ جب وہ زیر مشورہ امور میں اپنا سر کھپا کر کوئی رائے قائم کریں گے تو نہ تو اس پر عمل ہی ہوگا اور نہ کسی پہلو سے اس کی قدر ہی کی جائے گی تو دلداری اور عزت افزائی کے بجائے الٹا اس کا اثر ان پر یہ پڑتا کہ وہ اس سے متوحش ہوتے اور سمجھتے کہ ان کی رائیں نہ قبول کئے جانے کے لئے ہیں نہ عمل کئے جانے کے لئے بلکہ محض پیش کئے جانے کے لئے ہیں۔

حجۃ الاسلام کی اس تصریح سے واضح ہے کہ ان کے نزدیک صحابہ رضؓ سے مشورہ لیتے رہنے کا یہ حکم محض رسمی اور ظاہر دارانہ نہیں تھا بلکہ اس لئے تھا کہ مشورہ لینے کے بعد ان مشوروں پر عمل بھی کیا جائے۔

حجۃ الاسلام رحؒ نے اس مشورے کے حدود بھی نہایت واضح الفاظ میں متعین کر دیئے ہیں۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ مشورے صحابہ رضؓ سے ان تمام امور میں حاصل کرتے تھے جن کے بارے میں کوئی نص موجود نہ ہو، عام اس سے کہ یہ معاملات دینی نوعیت کے ہوں یا دنیوی نوعیت کے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :۔

وقال آخرون کان مامورا بمشاورتہم فی امور الدین والحوادث التی لا توقیف فیہا عن اللہ تعالیٰ

اور ایک دوسرے گروہ کا مذہب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ رضؓ سے مشورہ لینے کا یہ حکم دینی معاملات اور اس طرح کے حوادث میں بھی تھا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ

وفی امور الدنیا ایضا کما طریقہ الرای و غالب الظن وقد شاورھم یوم بدر فی الاساری وکان ذالک من امور الدین

(احکام القرآن۔ جلد ۲ ص ۴۹)

کی جانب سے کوئی متعین ہدایت وارد نہ ہو چکی ہو اور ان دنیوی معاملات میں بھی تھا جن میں فیصلے رائے و مشورہ اور گمان غالب کے تحت ہوا کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے موقع پر قیدیوں کے بارے میں صحابہ سے مشورہ لیا حالانکہ یہ معاملہ دینی معاملات کی قسم میں سے تھا۔

صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیتے رہنے کی مذکورہ بالا قرآنی ہدایت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اہتمام کے ساتھ عمل فرمایا اس کے متعلق ایک ایسے صحابی کی شہادت ملاحظہ ہو جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ آپؐ کی صحبت میں بسر فرماتے تھے۔

عن ابی ھریرۃ قال ما رأیت احدا اکثر مشورۃ لاصحابہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (رواہ احمد والشافعی)

حضرت ابوہریرہ رضا سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ لینے رہنے والا کبھی کسی شخص کو نہیں پایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قسم کے معاملات میں صحابہ سے مشورے لئے ہیں ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں جنگی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی ہر قسم کے معاملات داخل ہیں ہم ان میں سے چند معاملات بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

۱: بدر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اول اول جس مقام پر پڑاؤ ڈالا، جنگی مصلحت کے لحاظ سے وہ کچھ نامناسب تھا۔ بعض صحابہ رضا نے اس پر سوال اٹھایا کہ آپ نے یہ وحی الٰہی کے اشارے سے کیا ہے یا محض ذاتی صوابدید سے۔ جب آپ نے واضح فرمایا کہ آپ نے محض جنگی مصلحت سے ایسا کیا ہے تو ایک صحابی نے اس سے اختلاف کیا اور چشمے پر پڑاؤ ڈالنے کا مشورہ دیا۔ بالآخر صحابہ رضا سے مشورہ کے بعد یہی رائے قرار پائی اور اسی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل فرمایا۔[۱]

۲: غزوہ احزاب کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غطفان کے سامنے یہ پیش کش کرنا چاہی کہ اگر وہ [illegible] سے باز آجائیں تو آپؐ ان کو مدینے کے پھلوں کا ثلث حصہ سالانہ دینے رہیں گے۔ اس کے لئے ایک معاہدے کا مسودہ بھی قلم بند ہو چکا تھا۔ لیکن جب آپؐ نے اس معاملے میں صحابہ رضا، خصوصاً انصار کے لیڈروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے اس سے شدت کے ساتھ اختلاف کیا اور کہا کہ ہم تو ان سے صرف تلوار سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ بالآخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضا کی رائے قبول فرمائی اور معاہدے کا مسودہ چاک کرا دیا۔[۲]

---

[۱] (الطبقات الکبریٰ۔ ابن سعد، ج ۳ ص ۵۴)

[۲] (الطبقات الکبریٰ، ابن سعد، ج ۳ ص ۱۱۱)

۳ : غزوہ بدر کے قیدیوں کے معاملہ کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور طبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۱ میں یہ حدیث موجود ہے۔

یہ چند واقعات بطور مثال ذکر کئے گئے ہیں۔ ان سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ تمام اہم معاملات میں صحابہ سے مشورہ لیتے رہتے تھے بلکہ ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

شوریٰ، صحابہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب صحابہ رضؓ کا دور آیا تو ان کے سامنے ایک طرف تو آپؐ کا مذکورہ بالا اسوہ حسنہ تھا اور دوسری طرف قرآن و حدیث دونوں میں نہایت واضح ہدایات خود صحابہ کو دی گئی تھیں کہ وہ کس اساس پر اپنا سیاسی نظام قائم کریں اور اس میں قانون سازی کا طریقہ کیا ہو۔ ہم پہلے وہ قرآنی ہدایت نقل کرتے ہیں، جس پر صحابہ رضؓ کا قائم کردہ نظام سیاسی مبنی تھا۔ اس کے بعد احادیث اور خلفائے راشدین کے طرز عمل سے اس کی وضاحت کریں گے۔

اس سلسلے میں قرآن مجید میں اصولی ہدایت یہ دی گئی ہے :-

وامرھم شوریٰ بینھم (شوریٰ ۳۸) اور ان کا نظام باہمی مشورے پر مبنی ہے۔

اس اصولی ہدایت کی وضاحت بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی تھی :-

حدثنی ابوسلمۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن الامر یحدث لیس فی کتاب ولا سنۃ فقال ینظر فیہ العابدون من المومنین (سنن دارمی، باب التورع عن الجواب فیما لیس فی کتاب ولا سنۃ)

ابوسلمہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آن پڑے جس کا ذکر نہ تو کہیں قرآن میں ہو اور نہ سنت میں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ آپؐ نے فرمایا کہ اس معاملہ پر مسلمانوں کے صالح لوگ غور کرکے اس کا فیصلہ کریں گے۔

اسی مضمون کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے :-

عن علی قال قلت یا رسول اللہ ان عرض لی امر لم ینزل قضاء فی امرہ ولا سنۃ کیف تامرنی قال تجعلونہ شوریٰ بین اھل الفقہ والعابدین من المومنین ولا تقض فیہ برای خاصۃ

(الطبرانی فی الاوسط)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اگر میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کا ذکر نہ قرآن میں ہو نہ سنت میں تو اس معاملے میں آپ مجھے کیا روش اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اس کو قانون اسلامی میں بصیرت رکھنے والوں اور صالحین کے مشورے سے طے کرو اور اس میں تنہا اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کرو۔

چنانچہ اسی اصول پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ رضؓ نے نظام خلافت کی بنیاد رکھی جس میں خلیفہ کے انتخاب میں بھی جمہور مسلمین کے مشورہ کی شرط لازم ٹھہری اور خلافت کے فرائض کی انجام دہی میں بھی شوریٰ کو ضروری قرار دیا گیا۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضؓ جو اسلام میں پہلے خلیفہ ہیں، مسلمانوں کے مشورہ عام سے خلیفہ بنے۔ اور خلیفہ بننے کے بعد انہوں نے تمام معاملات کا فیصلہ، جن کے بارے میں ان کو کتاب وسنت میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملی، ان لوگوں کے مشورے سے کیا جو جمہور مسلمین کے معتمد لیڈر رہتے اور علم و دیانت کے لحاظ سے لوگوں میں بہتر خیال کئے جاتے تھے۔ ان کے طرز عمل سے متعلق سنن دارمی کی یہ حدیث ملاحظہ ہو:-

حدثنا میمون بن مهران فقال کان ابوبکر اذا ورد علیه الخصم نظر فی کتاب الله فاذا وجد فیه ما یقضی بینهم قضی به وان لم یکن فی الکتاب وعلم من رسول الله صلی الله علیه وسلم فی ذالک الامر سنة قضی به فان اعیاه خرج فسأل المسلمین وقال اتانی کذا وکذا فهل علمتم ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قضی فی ذالک بقضاء فربما اجتمع الیه النفر کلهم یذکر من رسول الله صلی الله علیه وسلم فیه قضاء فیقول ابوبکر الحمد لله الذی جعل فینا من یحفظ علم نبینا فان اعیاه ان یجد فیه سنة من رسول الله صلی الله علیه وسلم جمع رؤس الناس وخیارهم فاستشارهم فاذا اجتمع رایهم علی امر قضی به

ہم سے میمون بن مہران نے حدیث بیان کی کہ حضرت ابوبکر رضؓ کے پاس فریق معاملہ کوئی مقدمہ لاتے تو وہ پہلے اس پر کتاب اللہ کی روشنی میں غور کرتے۔ اگر اس میں ان کو کوئی ایسی چیز مل جاتی جس سے ان کے معاملے کا فیصلہ ہو سکتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے، اور اگر کتاب اللہ میں ان کو اس کے فیصلے کے لئے کوئی چیز نہ ملتی اور سنت رسول اللہ میں کوئی چیز مل جاتی تو پھر اس کے مطابق فیصلہ کرتے۔ لیکن سنت رسول اللہ میں بھی اگر کوئی چیز نہ پاتے تو مسلمانوں سے دریافت کرتے کہ میرے سامنے اس طرح کا معاملہ آیا ہے۔ کیا کسی شخص کے علم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا فیصلہ ہے جو اس قسم کے معاملے سے متعلق ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ کے پاس متعدد ایسے اشخاص جمع ہو جاتے جو اس قسم کے معاملے سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ بیان کرتے اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابوبکر رضؓ اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے کہ اُمت کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو رسول ﷺ کا علم محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ لیکن اس تلاش کے بعد بھی ان کو اگر رسول اللہ ﷺ کی کوئی سنت نہ ملتی تو پھر قوم کے لیڈروں اور ان کے اچھے لوگوں کو جمع کر کے ان سے

مشورہ کرتے اور جب وہ کسی بات پہ جم جاتے تو اس
کے مطابق وہ معاملے کا فیصلہ کر دیتے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں تمام سیاسی و اختلافی امور میں شوریٰ کا جو اہتمام رہا، اس کا تذکرہ شاہ ولی اللہؒ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے :۔

كان من سيرة عمر رضی الله عنه انه كان ليشاور الصحابة ويناظرهم حتى تنكشف الغمة وتاتيه الثلج فصار غالب قضاياه وفتاواه متبعة فی مشارق الارض ومغاربها (حجة الله البالغة ج ۱ ص ۱۳۲)

حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ معاملات میں صحابہؓ سے مشورہ کرتے اور ان سے بحث کرتے۔ یہاں تک کہ الجھن دور ہو جاتی اور دل پوری طرح مطمئن ہو جاتا۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ ان کے فیصلے اور فتوے تمام مشرق و مغرب میں معمول بہ بنے۔

صرف حضرت عمرؓ ہی کے زمانے کے متعلق نہیں بلکہ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے تک کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہ کی تحقیق یہی ہے کہ انتظام ملکی اور قانون سازی سے متعلق سارے معاملات شوریٰ کے ذریعے سے ہی انجام پاتے تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب "ازالۃ الخفا" میں فرماتے ہیں :۔

تحقیق آنست کہ تا زمانِ حضرت عثمانؓ اختلافِ مسائلِ فقہیہ واقع نمی شد در محل اختلاف بخلیفہ رجوع مے کردند و خلیفہ بعد مشاورت امرے اختیار مے کرد و ہماں امر مجمع علیہ مے شد (مقصد اول ص ۱۳۰)

اس معاملے میں تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک فقہی اختلافات برپا نہیں ہونے پائے تھے۔ جب کوئی اختلافی مسئلہ پیدا ہوتا تو لوگ خلیفہ کی طرف رجوع کرتے اور خلیفہ مشورہ کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرتا اور پھر وہی رائے اجماعی فیصلے کی حیثیت اختیار کر لیتی۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس شورائی نظام نے جس حد تک ترقی کی اس کی تفصیل مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنی مشہور تصنیف "الفاروق" میں وضاحت کے ساتھ پیش کی ہے۔ چونکہ یہ ساری بحث نہایت مضبوط دلائل پر مبنی ہے اور سارا مواد بحیثیت انہوں نے طبقات ابن سعد، کنز العمال، تاریخ طبری اور کتاب الخراج وغیرہ جیسی مشہور و مستند کتابوں سے لیا ہے اس وجہ سے ہم اس کے بعض ضروری حصوں کا اقتباس یہاں پیش کرتے ہیں۔

فاضل مصنف حضرت عمرؓ کی خلافت میں مجلس شوریٰ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"ان سب میں اصل الاصول مجلس شوریٰ کا انعقاد تھا۔ یعنی جب کوئی انتظام پیش آتا تھا تو ہمیشہ ارباب شوریٰ کی مجلس منعقد ہوتی تھی اور کوئی امر بغیر مشورے اور کثرت رائے کے عمل میں نہیں آ سکتا تھا۔ تمام جماعت اسلام میں اس وقت دو گروہ تھے جو کل قوم کے پیشوا تھے اور جن کو تمام عرب نے

گویا اپنا قائم مقام تسلیم کر لیا تھا۔ یعنی مہاجرین و انصار، مجلس شوریٰ میں ہمیشہ لازمی طور پر ان دو لوحق گروہوں کے ارکان شریک ہوتے تھے۔ انصار بھی دو قبیلوں میں منقسم تھے، اوس و خزرج۔ چنانچہ ان دونوں خاندانوں کا مجلس شوریٰ میں شریک ہونا ضروری تھا۔ مجلس شوریٰ کے تمام ارکان کے نام اگرچہ ہم نہیں بتا سکتے تاہم اس قدر معلوم ہے کہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ اس میں شامل تھے۔ مجلس کے انعقاد کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک منادی اعلان کرتا کہ الصلوٰۃ جامعۃ یعنی سب لوگ نماز کے لئے جمع ہو جائیں جب لوگ جمع ہو جاتے تھے تو حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے، نماز کے بعد منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتے تھے اور بحث طلب امر پیش کیا جاتا۔"

"معمولی اور روزمرہ کے کاروبار میں اس مجلس کے فیصلے کافی سمجھے جاتے تھے۔ لیکن جب کوئی امر اہم پیش آتا تھا تو مہاجرین اور انصار کا اجلاس عام ہوتا تھا اور سب کے اتفاق سے وہ امر طے پاتا تھا۔ مثلاً عراق و شام کے فتح ہونے پر جب بعض صحابہ نے اصرار کیا کہ تمام مفتوحہ مقامات فوج کی جاگیر میں دے دیئے جائیں تو بہت بڑی مجلس منعقد ہوئی جس میں تمام قدمائے مہاجرین اور انصار میں سے عام لوگوں کے علاوہ دس بڑے بڑے سردار جو تمام قوم میں ممتاز تھے اور جن میں پانچ شخص قبیلہ اوس اور پانچ قبیلہ خزرج کے تھے، شریک ہوئے۔ کئی دن تک مجلس کے جلسے ہوتے رہے اور نہایت آزادی و بے باکی سے لوگوں نے تقریریں کیں۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے جو تقریر کی اس کے جستہ جستہ فقرے ہم اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ اس سے منصب خلافت کی حقیقت اور خلیفہ وقت کے اختیارات کا اندازہ ہوتا ہے :-

انی لم ازعجکم الا لان تشترکوا فی امانتی فیما حملت من امورکم فانی واحد کاحدکم ولست ارید ان تتبعوا ہذا الذی ھوای

میں نے آپ حضرات کو اس لئے زحمت دی ہے کہ آپ کے معاملات کی دیکھ بھال کا جو بار امانت مجھ پر ڈالا گیا ہے آپ اس کے اٹھانے میں میری مدد کریں میں تم ہی جیسا ایک شخص ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ اس چیز کا اتباع کریں جو میری خواہش کے مطابق ہو۔[1]

۲۱ھ میں جب نہاوند کا سخت معرکہ پیش آیا اور عجمیوں نے اس سر و سامان سے تیاری کی کہ لوگوں کے نزدیک خود خلیفہ وقت کا اس مہم پر جانا ضروری ٹھہرا تو بہت بڑی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی۔ حضرت عثمانؓ طلحہ بن عبیداللہؓ، زبیر بن العوامؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ وغیرہ نے باری باری کھڑے ہو کر تقریریں

---

[1] یہ ترجمہ 'الفاروق' میں نہیں ہے بلکہ ہم نے کیا ہے۔

کیں اور کہا کہ آپ کا خود موقع جنگ پر جانا مناسب نہیں۔ پھر حضرت علی رضؓ کھڑے ہوئے اور ان لوگوں کی تائید میں تقریر کی۔ غرض کثرت رائے سے یہی فیصلہ ہوا کہ خود حضرت عمرؓ موقع جنگ پر نہ جائیں۔ اسی طرح فوج کی تنخواہ، دفتر کی ترتیب، عمال کا تقرر، بعض قوموں کو تجارت کی آزادی اور ان پر محصول کی تخفیف اس قسم کے بہت سے معاملات ہیں جن کی نسبت تاریخوں میں بتصریح مذکور ہے کہ مجلس شوریٰ میں پیش ہو کر طے پائے" "مجلس شوریٰ کا انعقاد اور اہل الرائے کے مشورے استحسان اور تبرع کے طور پر نہ تھے۔ بلکہ حضرت عمرؓ نے مختلف موقعوں پر صاف صاف فرما دیا تھا کہ مشورے کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں۔ ان کے خاص الفاظ یہ ہیں "لا خلافة الا عن مشورة" مجلس شوریٰ کا اجلاس اکثر خاص خاص ضرورت کے پیش آنے کے وقت ہوتا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ ایک اور مجلس تھی جہاں روزانہ انتظامات اور ضروریات پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہ مجلس ہمیشہ مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی اور صرف مہاجرین صحابہ اس میں شریک ہوتے تھے۔ صوبجات اور اضلاع کی روزانہ خبریں جو دربار خلافت میں پہنچتی تھیں حضرت عمرؓ ان کو اس مجلس میں بیان کیا کرتے تھے اور کوئی بحث طلب امر ہوتا تھا تو اس میں لوگوں سے انتصواب کیا جاتا تھا۔ مجوسیوں پر جزیہ مقرر کرنے کا مسئلہ اول اسی مجلس میں پیش ہوا تھا۔ مورخ بلاذری نے اس مجلس کا حال ایک ضمنی تذکرے میں ان الفاظ میں لکھا ہے :-

كان للمهاجرين مجلس في المسجد فكان عمر يجلس معهم فيه ويحدثهم عما ينتهي اليه من امور الآفاق فقال يوما ما ادري كيف اصنع بالمجوس۔

مہاجرین کی ایک مجلس مسجد نبوی میں اپنی نشست کیا کرتی تھی حضرت عمرؓ اس کے سامنے وہ تمام حالات رکھا کرتے تھے جو مملکت کے مختلف گوشوں سے ان کو پہنچا کرتے تھے اس مجلس میں ایک روز انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجوس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔[1]

حضرت عمرؓ کے زمانے میں نہ صرف اہم امور ملکی شوریٰ سے انجام پاتے تھے بلکہ صوبجات اور اضلاع کے حکام بھی اکثر رعایا کی مرضی سے مقرر کیے جاتے تھے۔ چنانچہ یہی علامہ شبلی نے کتاب الخراج کے حوالہ سے لکھتے ہیں :-

"کوفہ، بصرہ اور شام میں جب عمال مقرر کیے جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے ان تینوں صوبوں میں احکام بھیجے کہ وہاں کے لوگ اپنی اپنی پسند کے ایک ایک شخص کا انتخاب کر کے بھیجیں جو ان لوگوں کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ دیانت دار اور قابل ہو۔ چنانچہ کوفہ سے عثمان بن فرقد، بصرہ سے مجاج بن علاط، شام

[1] یہ ترجمہ "الفاروق" میں نہیں ہے بلکہ ہم نے کیا ہے۔

سے معاویہ بن یزید کو لوگوں نے منتخب کر کے بھیجا اور حضرت عمرؓ نے انہی لوگوں کو ان مقامات کا حاکم مقرر کیا"

اس سے امر میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ اگر کسی اہم معاملہ میں خلیفہ کو یقین ہو کہ جو کچھ وہ سمجھ رہا ہے وہی صحیح ہے، اس کے خلاف راہ اختیار کرنے میں بڑا خطرہ ہے تو وہ اپنے یقین کی بنا پر اپنی رائے پر اصرار کر سکتا ہے۔ لیکن خلیفہ کو یہ بات ملحوظ رکھنی پڑتی ہے کہ وہ کوئی معصوم ہستی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اجتہادی اور مصلحتی امور (اور شوریٰ کا تعلق اسی طرح کے امور سے ہوتا ہے) میں اس کو دوسرے اہل الرائے کے مقابل میں اپنے یقین اور اپنی رائے کو اس درجہ اہمیت دینے اور اس کے مانے جانے پر اصرار کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی تنہا رائے کے مقابل میں دوسرے اہل الرائے کی متفقہ رائے یا ان کی اکثریت کی رائے کو رد کر دے۔ اگر ایک امر اجتہادی میں کوئی خلیفہ اپنے یقین کو اس درجہ شک و شبہ سے بالا تر سمجھتا ہے تو دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایک معصوم ہستی سمجھتا ہے۔

خلیفہ کے لیے مجلس شوریٰ کی اکثریت کے فیصلوں کی پابندی ضروری ہونے کی اوّل دلیل تو وہ ہے جو صاحب احکام القرآن ابوبکر جصاص نے دی ہے کہ یہ شوریٰ کی فطرت کا اقتضا ہے کہ اہل شوریٰ کی اکثریت کے فیصلہ کو تسلیم کیا جائے اس لئے کہ یہ بات بالکل بے معنی سی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام میں شوریٰ کا حکم تو اس شد و مد سے دیا جائے اور مقصود صرف یہ ہو کہ چند لوگوں کو شریک مشورہ کر کے ذرا ان کی دلداری اور عزت افزائی کر دی جائے۔ خلیفہ کے لئے ان کے مشوروں کی پابندی ضروری نہ ہو۔ صاحب احکام القرآن کے نزدیک یہ مشکل لوگوں کی دلداری اور عزت افزائی کی نہیں بلکہ الٹے ان کی دل شکنی اور توہین کے مرادف ہے۔

دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ ایک شخص کے مقابل میں ایک جماعت کی رائے بہرحال اپنے اندر صحت و اصابت کے زیادہ امکانات رکھتی ہے۔ اس وجہ سے عقل و فطرت کا تقاضا یہی ہے کہ خلیفہ اپنی تنہا رائے کے مقابل میں یا اپنے چند ہم خیالوں کی رائے کے مقابل میں اکثریت کی رائے کو رد نہ کر دے۔ آخر ایک اجتہادی یا مصلحتی معاملہ میں اس کو یہ علم کس طرح ہوا کہ اس کی رائے صحیح اور دوسروں کی رائے غلط ہے۔ صحت اور غلطی کا امکان دونوں طرف ہے لیکن صحت کا غالب امکان اس طرف ہے جدھر اکثریت ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر فرد کے مقابل میں جمہور کے مسلک اور انفرادی اجتہاد کے بالمقابل اجماع کو شریعت میں ترجیح دی گئی ہے۔

اس کی تیسری دلیل یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ کی کوئی ایک مثال بھی ہمارے سامنے ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ انہوں نے کسی قابل مشورہ امر میں لوگوں سے مشورہ کیا ہو اور پھر ان کے متفق علیہ مشورہ یا ان کی اکثریت کی رائے کے خلاف قدم اٹھایا ہو۔ خلفائے راشدینؓ تو درکنار خود حضور نبی اکرم صلعم کے متعلق یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ آپ نے بھی جس معاملہ میں لوگوں سے مشورہ لیا اس میں اکثریت کے فیصلہ کے مطابق ہی عمل کیا۔ کوئی ایک مثال بھی اس کی خلاف ورزی کی حضورؐ سے منقول نہیں ہے حالانکہ حضورؐ نہ تو کسی معاملہ میں لوگوں کے مشورہ

کے محتاج تھے اور نہ کسی مشورہ کی پابندی آپ کے لئے لازمی قرار دی جا سکتی۔

صرف حضرت ابوبکرؓ کی زندگی سے دو واقعے ایسے پیش کیے جاتے ہیں جن سے بعض حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ امیر اپنی تنہا رائے کے ذریعہ سے اہل شوریٰ کے متفقہ فیصلہ یا ان کی اکثریت کی رائے کو رد (VETO) کر سکتا ہے۔ ایک حضرت ابوبکرؓ کا موقف مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے معاملہ میں، دوسرا لشکر اسامہ کی روانگی کے معاملہ میں۔ ان دونوں مواقع پر حضرت ابوبکرؓ نے جو موقف اختیار فرمایا اس کو عام طور پر غلط سمجھا گیا ہے اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ ان کے موقف کی وضاحت کر دی جائے۔

پہلے مانعین زکوٰۃ کے معاملہ کو لیجئے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد عرب کے جو قبائل مرتد ہو گئے تھے ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو کہتے تھے کہ ہم نماز تو پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں ادا کریں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو بزور شمشیر ادائیگی زکوٰۃ پر مجبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ معاملہ ان کے نزدیک شریعت کے ان واضح اور منصوص مسائل میں سے تھا جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس وجہ سے اس میں انہوں نے شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا اپنے کو پابند نہیں سمجھا۔ بلکہ روزہ، نماز، حدود، تعزیرات اور اس قسم کے دوسرے مسائل کی طرح اس میں بحیثیت خلیفہ کے اپنی ذمہ داری خدا کے قانون کی تنفیذ سمجھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اسی نقطہ نظر کے مطابق یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر یہ اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا نہ کریں تو ان کو طاقت کے زور سے اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

جب لوگوں کو ان کے اس فیصلے کا علم ہوا تو کچھ لوگوں نے ان سے کہا کہ ابھی اسلام کا معاملہ نیا نیا ہے۔ مخالفین کی تعداد زیادہ ہے اور ہم تھوڑے ہیں۔ بیک وقت سارے عرب کا مقابلہ مشکل ہوگا اس وجہ سے بہتر ہوگا کہ یہ لوگ اگر نماز کا اقرار کرتے ہیں تو صرف زکوٰۃ کے لیے ان سے جنگ نہ کی جائے۔ بلکہ جس حد تک بھی یہ دین کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں اسی پر قناعت کر لی جائے۔ ان لوگوں نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں ایک حدیث بھی پیش کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :-

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ فاذا قالوھا عصموا منی دماءھم و اموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ

مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کریں۔ جب وہ اس کا اقرار کر لیں گے تو ان کی جانیں اور ان کے مال میری طرف سے محفوظ ہو جائیں گے مگر اسی کلمہ کے کسی حق کے تحت اور ان کے باطن کا محاسبہ اللہ کے ذمہ ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ زکوٰۃ تو اس کلمہ کے حقوق میں شامل ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں سے جنگ ناگزیر ہے۔

جب لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنے فیصلہ پر بالکل عازم پایا تو حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ میں حضرت ابوبکرؓ سے گفتگو کریں۔ جب حضرت عمرؓ نے گفتگو کی تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے سامنے اوپر والی حدیث کی وضاحت ایک دوسری حدیث کی روشنی میں کی کہ میں نے رسول اللہ صلعم کو فرماتے سنا ہے کہ :-

امرت ان اقاتل الناس علی	مجھے حکم ملا ہے کہ میں تین چیزوں پر لوگوں سے جنگ کروں کلمہ
ثلاث شهادة ان لا اله الا الله	لا الہ الا اللہ کی شہادت پر، نماز قائم کرنے پر اور زکوٰۃ
واقام الصلوٰة وایتاء الزکوٰة	کی ادائگی پر۔

پس اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں میں اس سے کم پر قناعت نہیں کروں گا۔ اگر یہ لوگ اس زکوٰۃ میں سے ایک رسی بھی روکیں گے جو رسول اللہؐ کو ادا کرتے رہے ہیں تو میں اس کے لیے بھی ان سے جنگ کروں گا۔ یہاں تک کہ اللہ جو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔ اگر میں ان لوگوں سے جنگ کرنے کے لیے کسی کو بھی نہ پاؤں گا تو ان سے تنہا جنگ کروں گا۔

ان کی اس وضاحت اور اس عزم بالجزم کے اظہار کے بعد لوگ مطمئن ہو گئے۔ بالآخر انہوں نے مانعین زکوٰۃ پر فوج کشی کی اور ان کو بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ لوگوں نے ان کے اس اقدام کو اس قدر پسند کیا کہ ابو رجاء عطاردی بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ لوگ جمع ہیں اور حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کا سر بار بار چومتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں آپ کے قربان جاؤں، اگر آپ نہ ہوتے تو ہم تو تباہ ہو گئے ہوتے[1]

اس واقعہ پر غور کرنے سے چند حقیقتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ معاملہ شوریٰ اور خلیفہ کے درمیان کا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کو شوریٰ کے سامنے پیش ہی نہیں کیا تھا۔ شوریٰ کے سامنے وہ مسائل پیش ہوتے ہیں جو اجتہاد اور امور مصلحت سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ معاملہ دین کا ایک منصوص مسئلہ ہے۔ اسلامی حکومت میں کسی ایسی جماعت کے بحیثیت مسلم حقوق شہریت باقی ہی نہیں رہتے جو بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دے۔ یہ چیز اسلامی قانون میں طے شدہ ہے اس وجہ سے حضرت ابوبکرؓ کی ذمہ داری یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو شوریٰ کے سامنے رکھتے۔ بلکہ بحیثیت خلیفہ ان کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ وہ اس بارے میں قانون کی تنفیذ کرتے چنانچہ انہوں نے یہی کیا۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ اسلامی حکومت کے حدود میں کوئی جماعت اگر قتل و غارت شروع کر دے تو خلیفہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس جماعت کی سرکوبی کے لیے شوریٰ سے اجازت طلب کرے بلکہ اس کا فرض یہ ہے کہ قرآن نے محاربین کے لیے جو قانون بنایا ہے اس کی تنفیذ کے لیے اپنے

---

[1] یہ پورا بیان ابن قتیبہ کی الامامہ والسیاسہ سے لیا گیا ہے۔

اختیارات بے دھڑک استعمال کرے۔

دوسری یہ کہ جن لوگوں نے امیر کے اس اقدام سے متعلق تردد کا اظہار کیا ان کو ایک حدیث کے سمجھنے میں غلط فہمی ہو رہی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس حدیث کے اجمال کو ایک دوسری حدیث سے جو خود انہوں نے حضورؐ سے سنی تھی، واضح کر دیا جس سے لوگ مطمئن ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں کے نزدیک اس حدیث سے زیادہ وقیع حدیث اور کون ہو سکتی تھی جس کے راوی خود حضرت ابوبکر صدیقؓ ہوں۔

تیسری یہ کہ حضرت ابوبکرؓ نے یہ جو فرمایا کہ اگر ان لوگوں سے لڑنے کے لیے میں کسی کو نہیں پاؤں گا تو میں تنہا ان سے لڑوں گا۔ یہ شوریٰ کے کسی فیصلے کو ویٹو کرنے والی بات نہیں ہے بلکہ یہ اس ذمہ داری کا صحیح صحیح اظہار و اعلان ہے جو دین کے واضح اور قطعی احکام کی تنفیذ اور ان کے اجرا سے متعلق بحیثیت خلیفہ کے ان پر عاید ہوتی تھی۔ اسلام میں خدا اور اس کے رسول کے احکام کی تنفیذ کے لیے خلیفہ کی اصلی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ان کی تنفیذ کے لیے اپنی جان لڑا دے اگرچہ ایک شخص بھی اس کا ساتھ نہ دے۔ جمہور کے مشوروں کا پابند وہ مصلحتی اور اجتہادی امور میں ہے نہ کہ شریعت کی قطعیات میں۔

اسی طرح لشکر اسامہؓ کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی ساری تیاریاں حضورؐ کے حکم سے حضورؐ کی حیات مبارک ہی میں ہو چکی تھیں۔ اس کے لیے اشخاص بھی حضورؐ کے منتخب کردہ تھے اس کے لیے جھنڈا بھی خود حضورؐ نے باندھا تھا۔ یہاں تک کہ اگر حضورؐ کی علالت نے تشویش انگیز شکل نہ اختیار کر لی ہوتی تو یہ لشکر روانہ ہو چکا ہوتا اسی دوران میں حضورؐ کا وصال ہو گیا اور حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے خلیفہ ہونے کے بعد فطری طور پر اپنی سب سے بڑی ذمہ داری یہ سمجھی کہ حضورؐ جس لشکر کے بھیجنے کی ساری تیاریاں اپنے سامنے کر چکے تھے اور جس کے جلد سے جلد بھیجنے کے دل سے آرزومند تھے اس لشکر کو اس کی پیش نظر مہم پر روانہ کر دیں۔ بحیثیت خلیفہ رسولؐ کے ان کی سب سے بڑی ذمہ داری اور ان کے لیے سب سے بڑی سعادت اس وقت کوئی ہو سکتی تھی تو بلاریب یہی ہو سکتی تھی کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کو پورا کریں۔ اس کام کے لیے وہ شوریٰ سے کسی مشورہ کے محتاج نہ تھے کیونکہ اس لشکر کے بھیجنے کے فیصلہ سے متعلق سارے امور خود حضورؐ کے سامنے بلکہ حضورؐ کے حکم سے طے پا چکے تھے۔ پیغمبرؐ کے خلیفہ کی حیثیت سے ان کا کام پیغمبرؐ کے فیصلہ کو نافذ کرنا تھا نہ کہ اس کو بدل دینا۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے جب وقت کے مخصوص حالات کی بنا پر اس لشکر کی روانگی کو خلاف مصلحت قرار دیا تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس جھنڈے کو رسول اللہؐ نے باندھا ہے میں اس کو کھولنے کے لیے تیار نہیں۔

بہرحال یہ دونوں واقعے کسی طرح بھی اس بات کی دلیل نہیں بن سکتے کہ خلیفہ کو شوریٰ کے فیصلے رد کر دینے کا حق ہے۔ یہ اگر دلیل ہیں تو اس بات کی دلیل ہیں کہ خدا اور رسول کے قطعی اور واضح احکام کی تنفیذ کے معاملہ میں خلیفہ شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری صرف ان احکام کی تنفیذ ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام میں شوریٰ متعین بھی ہے اور امیر اس کی اکثریت کے فیصلوں کا

پابند بھی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ تمام اہل الرائے مرکز میں مجتمع رہتے تھے۔ جماعتوں اور قبیلوں کے لیڈر وقت کے نظام معاشرت کے تقاضے کے تحت معین ہوتے تھے۔ نیز مملکت کا دائرہ بہت زیادہ وسیع نہ تھا اس وجہ سے یہ شورائی نظام بہت سادہ اور بسیط قسم کا تھا۔ اس زمانہ میں حالات بہت مختلف ہیں۔ اس وجہ سے شوریٰ کو متعین کرنے کے لیے بعض ضروری اصلاحات کے ساتھ انتخاب کے جدید طریقوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے اور شوریٰ اور امیر کے باہمی تعلقات کی تعیین کے لیے ضروری قوانین بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ ایسا کرنا اسلام کے منشا کے خلاف نہ ہوگا۔

مجلس شوریٰ کی نوعیت اور اس کے ارکان کی صفات

مجلس شوریٰ کی نوعیت اور اس کے ارکان کی صفات سے متعلق بھی بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ شوریٰ صرف علماء و فقہا پر مشتمل ہوتی تھی۔ دوسرے لوگوں کو اس میں بار حاصل نہ تھا۔ بعض لوگ اس کو ایک بالکل مبہم اور غیر متعین چیز سمجھتے ہیں یعنی خلیفہ جن اشخاص سے چاہے مشورہ کرے۔ کسی متعین شوریٰ سے مشورہ کرنے کا وہ پابند نہیں ہے۔ ان غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے چند ضروری باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اہل شوریٰ کی صفات سے متعلق مندرجہ ذیل ہدایت دی گئی ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (نساء - ۸۳)

اور جب ان کو امن یا خطرے کی کوئی اطلاع ملتی ہے تو اس کو پھیلا دیتے ہیں اور اگر وہ اس کو رسول اور اپنے اہل حل و عقد کے سامنے پیش کرتے تو اس کو وہ لوگ جو اہل بصیرت ہیں ٹھیک طور پر سمجھ سکتے۔

اسلامی نظام میں جن لوگوں کے سامنے معاملات پیش کئے جانے چاہئیں، اس آیت میں ان کی دو صفتیں متعین طور پر بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمانوں کے اولوالامر یعنی سربراہ کار ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ اہل استنباط یعنی معاملات کی سوجھ بوجھ اور دینی و دنیاوی بصیرت رکھنے والے ہوں۔ ہمارے مفسرین نے مذکورہ بالا الفاظ کی یہی تفسیر کی ہے۔

کشاف میں مذکورہ آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی گئی ہے ھم کبراء الصحابۃ البصراء بالامور (ج ۱۔ ص ۲۱۶) اس سے مراد اکابر صحابہ اور اہل بصیرت لوگ ہیں۔ اسی کے ہم معنی الفاظ نیشاپوری اور امام رازی کی تفسیر میں وارد ہیں۔

روایات سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ شوریٰ کے لیے وہ لوگ بلائے جاتے تھے جو عوام کے معتمد لیڈر اور دینی و دنیوی معاملات میں بصیرت رکھنے والے اور مسلمانوں کے سربراہ کار ہوتے تھے۔ اس معاملہ میں بوڑھے اور جوان کی تخصیص بھی نہ تھی۔ چنانچہ بخاری، کتاب التفسیر سورہ اعراف میں حضرت ابن عباس رضؓ کا قول مروی ہے کہ کان القراء اصحاب مجالس عمر و مشاورتہ کھولا کانوا او شبانا (حضرت عمرؓ کی مجلس مشاورت میں ذی علم

لوگ ہوا کرتے تھے خواہ وہ سن رسیدہ ہوں یا جوان ہوں) حضرت ابوبکرؓ کے متعلق اوپر گزر چکا ہے کہ وہ مشورہ کے لئے مسلمانوں کے لیڈروں اور ان کے اخیار کو بلاتے تھے۔ جمع رؤوس الناس و خیارھم - بعض روایات میں ایک جامع لفظ "صالحین" کا بھی استعمال ہوا ہے۔ تاریخ اور سیرت میں متعین طور پر جن اصحاب شوریٰ کے نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں :-

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت سعد بن معاذؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ وغیرہ۔

یہ ارباب حل و عقد یا اصحاب الرائے اگرچہ موجودہ سیاسی مفہوم میں قوم کے نمائندے نہیں ہوتے تھے اس لیے کہ اس زمانہ میں انتخابات کا موجودہ طریقہ روشناس نہیں ہوا تھا۔ لیکن یہ لوگ اپنے اپنے گروہوں کے معتمد نمائندے ضرور ہوتے تھے۔ ان کے معتمد ہونے کی دلیل یہ ہوتی تھی کہ ان کے گروہوں کے لوگ اپنے معاملات میں انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ نیز بعض اصحاب شوریٰ دینی و مذہبی بصیرت کے اعتبار سے کوئی نمایاں مقام مسلمانوں میں رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ مہاجرین کے مسلّم لیڈر تھے اور مذہبی بصیرت اور سیاسی سوجھ بوجھ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ انصار کی دونوں پارٹیوں —— اوس و خزرج، کے لیڈر تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ بنو امیہ کے لیڈر تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ بنی زہرہ کے لیڈر تھے۔ حضرت علیؓ بنی ہاشم کے لیڈر تھے۔ معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ قرآنی علوم اور فقہ کے ماہرین میں سے تھے۔

اسلامی نظام حکومت دوسرے نظامہائے حکومت کے مقابل میں

اسلامی نظام حکومت کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر جب ہم پارلیمانی یا صدارتی طرز حکومت پر غور کرتے ہیں تو ان میں سے کوئی نظام حکومت بھی ایسا نظر نہیں آتا جو بعینہٖ اس کی جگہ لے سکے ان دونوں کے اندر خوبیاں بھی ہیں اور نقائص بھی۔ مگر اسلامی نظام حکومت کے ساتھ ان میں سے کسی کا بھی میل نہیں۔ ان دونوں کے اندر اسلامی پہلو سے جو بڑے بڑے نقص ہیں، ہم بالاجمال ان کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں۔

پہلے پارلیمانی نظام حکومت کو لیجئے :-

اس نظام میں عملاً تو تمام اختیارات وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی لازماً اس میں ایک نمائشی (TITULOR) صدر حکومت یا بادشاہ بھی ہوتا ہے جو وزرا کا تقرر اور ریاست کے بعض دوسرے رسوم ادا کرتا اور ادا کراتا ہے۔ اسلامی نظام میں اس قسم کے کسی نمائشی گرگے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے جو خلیفہ ہوتا ہے، اسی کو وہ تمام حقیقی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو حکومت کو چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ اسلامی نظام پارلیمانی نظام کی اس غیر فطری ثنویت سے بالکل پاک ہے اور اس کا مزاج کسی شکل میں بھی اس کو قبول نہیں کر سکتا۔

اس میں دوسری خرابی اسلامی نقطہ نظر سے یہ ہے کہ یہ نظام درحقیقت پارٹی گورنمنٹ سسٹم ہے۔ جو پارٹی لیجسلیچر کے اندر اکثریت حاصل کر لیتی ہے ریاست کا نمائشی صدر یا بادشاہ اسی کے لیڈر کو حکومت بنانے اور چلانے پر مقرر کرتا ہے اکثریت کی پارٹی کا لیڈر وزیر اعظم بنتا ہے اور وہ اس وقت تک حکومت کرتا ہے جب تک اس کو ایوان کی اکثریت کا اعتماد حاصل رہے۔ یہ پارٹی سسٹم نہ ہو تو یہ نظام حکومت نہیں چل سکتا۔ لیکن اسلامی نظام اس پارٹی سسٹم کا محتاج نہیں ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ پارٹی سسٹم اصولاً اسلامی نظام حکومت کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرنے اور اس کو اپنے نظام حکومت کی بنیاد بنانے کے بجائے اس کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔

نیز جمہوریتیں آئینی اور قانونی موشگافیوں کے سبب سے ایسی الجھی ہوئی اور پھیلی ہوئی سی چیز بن گئی ہیں کہ اگر ملک کے لیے کوئی نازک مرحلہ پیش آجائے تو ان جمہوریتوں کا سارا پول کھل جاتا ہے اور حکومت چلانے والے مجبور ہو جاتے ہیں کہ آئین کے الفاظ اور جمہوریت کے رسوم کے احترام پر ملک کے تحفظ و بقا کو ترجیح دیں۔ لیکن اسلام میں جو جمہوریت و شورائیت ہے وہ اس قدر سادہ اصولی اور مقصدی ہے کہ اس کا احترام امن و جنگ ہر حالت میں یکساں باقی رکھا جا سکتا ہے۔ نازک سے نازک حالات کے اندر بھی اس کے سبب سے حکومت کی صلاحیتِ کار، اس کی کارکردگی اور اس کے بروقت اقدامات میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے اسلامی نظام میں خلیفہ کو کبھی شورائیت کے نظام کو معطل کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے نہایت ہی اہم حالات کے زمانے تھے لیکن انہیں ایک دن کے لیے بھی شورائیت کو معطل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اسی طرح وہ صدارتی طرز حکومت بھی جو امریکہ میں رائج ہے اسلام کے طرز حکومت کے بالکل خلاف ہے۔

اوّل تو عاملہ اور مقننہ کے درمیان اس قسم کی شدید حد بندی جس قسم کی حد بندی صدارتی نظام میں ضروری سمجھی گئی ہے اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام میں خلیفہ قانون سازی (جس حد تک قانون سازی میں انسانوں کا دخل جائز ہے) کے معاملات میں براہ راست حصہ لے سکتا ہے۔ وہ جو قانون مفید سمجھے شرعی حدود کے اندر اس کو اپنی شوریٰ کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور اگر ضرورت محسوس کرے تو وہ مجلس قانون ساز کے سامنے اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں لمبی سے لمبی تقریر بھی کر سکتا ہے۔

ثانیاً صدارتی نظام میں ایک مرتبہ صدر کے منتخب ہو جانے کے بعد اس کی مقررہ مدت صدارت تک جو آزادی و بے قیدی اور جو غیر مسئولیت اس کے لیے تسلیم کر لی گئی ہے اسلام اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم نہیں کرتا۔ صدارتی نظام میں صدر جب ایک مرتبہ صدر بن گیا تو اس کے عہدہ کی مدت کے اندر کوئی اس کو اس کی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔ اگرچہ ملک کا ایک ایک ووٹر مطالبہ کر رہا ہو کہ اس کو ہٹایا جائے۔ مجلس قانون ساز اس کے غلط سے غلط اقدام پر بھی کوئی گرفت کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کر سکتی ہے تو بس یہ کہ اس کے راستے میں کچھ رکاوٹیں پیدا کرے اور اڑنگے ڈالے۔ لیکن ان رکاوٹوں اور

تاریخ تصوف اسلامی
پروفیسر یوسف سلیم چشتی

صوفیائے متقدّمین کا اجمالی تذکرہ

(۳)

(۲۰) احمد ابن خضرویہ م ۲۴۰ھ

بلخ کے ساکن تھے اور خراسان کے نامور مشائخ میں سے تھے۔ ابو تراب نخشبی اور حاتم الاصم کے ہم نشین تھے۔ ابراہیم ادھم ابو حفص حداد اور بایزید بسطامی کی زیارت کی تھی۔ ابو حفص حداد سے لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اس جماعت میں کسے بزرگ ترین پایا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہمت اور صدق احوال کے لحاظ سے میں نے کسی کو احمد بن خضرویہ سے بڑھ کر نہیں پایا۔ ۲۴۰ھ میں وفات پائی اور بلخ میں مدفون ہوئے۔

کسی شخص نے احمد ابن خضرویہ سے کہا۔ مجھے کچھ وصیت (نصیحت) کیجئے۔ انہوں نے کہا "اَمِتْ نَفْسَکَ حَتّٰی تُحْیِیَھَا" اپنے نفس پر موت وارد کر دے۔ تاکہ تو اسے (دوبارہ) زندہ کر سکے۔

ان کا قول ہے کہ انسان جتنا زیادہ خوش خلق ہوگا اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب ہوگا۔ نیز یہ کہ جو شخص درویشوں کی خدمت کرتا ہے اسے تین نعمتیں عطا ہوتی ہیں (۱) التواضع (۲) حسن الادب (۳) سخاوۃ النفس نیز یہ کہ "تمام عبودیت، حریت میں ہے اور حریت کا تمام عبودیت کی تحقیق میں ہے۔" اس بلیغ قول کا مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان کو حریت نصیب نہ ہو وہ مقام عبودیت کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔ یعنی صحیح معنی میں عبادت نہیں کر سکتا۔ اور جب تک آدمی سچے معنی میں عبودیت کے مدارج طے نہ کرے وہ حریت کی نعمت سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

---

(۴۱) ذوالنون مصری م ۲۴۵ھ

ابوالفیض ثوبان بن ابراہیم ذوالنون مصری تیسری صدی کے مشاہیر صوفیہ میں سے ہیں۔ ان کے والد نوبیا (سوڈان) کے رہنے والے تھے، مگر گردش روزگار سے قریش کے غلام ہوگئے۔ ذوالنون مکے میں پیدا ہوئے۔ امام مالک ابن انس رضؒ سے حدیث (مؤطا) پڑھی اور فقہ میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد مختلف ممالک کی سیاحت کی اور ائمہ تصوف سے علمی اور روحانی استفادہ کیا۔ وہ اپنے زمانے میں قطب الاقطاب تھے۔ صاحب مقام و حال و وقت تھے۔ توحید کے اسرار و رموز کے شناسا اور مرجع خواص تھے۔

وہ پہلے صوفی تھے جنہوں نے اسرار تصوف کو برملا بیان کیا اور اشارت کو عبارت (رموز کو الفاظ) میں بیان کیا۔ جنید اور شبلی نے انہی کے افکار و تعلیمات کو مدون کرکے تصوف کو بطور نظام افکار پیش کیا۔ چنانچہ جنید کہتے ہیں کہ میں نے ذوالنون کی تعلیمات کو خلوت میں خواص کے سامنے بیان کیا۔ لیکن میرے ہمعصر شبلی نے انہیں برسر منبر آشکارا کر دیا۔ ذیل میں ذوالنون کی مشہور دعا یا مناجات درج کی جاتی ہے:-

"اے اللہ! حیوانات کی آوازوں میں، درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ میں، موجوں کے شور میں، پانی کے بہاؤ میں، پرندوں کے نغموں میں، شفق کی سرخی میں، طلوع آفتاب کی روشنی میں، ہواؤں کی سنسناہٹ میں اور بجلی کی کڑک میں غرضکہ ہر شے میں، میں تیری توحید ذاتی کی شہادت اور تیری یکتائی کی دلیل بچشم خود ملاحظہ کرتا ہوں۔ نیز یہ یقین کرتا ہوں کہ تو بے ہمتا ہے، بے نظیر ہے، بے مثل ہے، ہمہ جا حاضر و ناظر ہے۔ عالم و قادر و عادل و حکیم مطلق ہے۔ تیری ذات ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہے۔ تو جہالت، حماقت، نادانی، ظلم اور کذب سے منزہ ہے۔ میں تمام مصنوعات میں تیری صفت اور قدرت کا مشاہدہ کرتا ہوں۔ مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیری رضا طلب کروں اور میری رضا اسی طلب میں ہو۔ آمین۔ ذیل میں اُن کے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں:-

(۱) علم کی تین قسمیں ہیں (ا) اللہ کی وحدانیت کا علم جو سب مومنوں کو حاصل ہے (ب) اللہ کی ہستی کا وہ علم جو برہان سے حاصل ہوتا ہے جو علما سے مختص ہے (ج) صفات توحید کا علم جو صرف ان اولیاء اللہ کو حاصل ہوتا ہے جو اپنے دل کے آئینے میں اس کا جمال دیکھ سکتے ہیں۔

(۲) مقام صدق یقین حاصل کرنے کے لئے خلوت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ صاحب خلوت اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں دیکھتا۔ اور جب وہ صرف اللہ کو دیکھتا ہے تو مشیت ایزدی کے سوا اور کوئی شے اس کے حق میں مخرکہ نہیں بن سکتی۔

(۳) ہر طالب شفاعت، اپنی طلب شفاعت کی بنا پر، مراقبہ و مشاہدہ حق سے محجوب (محروم) ہو جاتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ الحق تو ہر جگہ حاضر ہے اور اس کا کلام بھی حق ہے۔ لہٰذا اگر الحق، طالب شفاعت کے سامنے خود جلوہ گر ہو جائے تو پھر طالب کو کسی شفیع کی کوئی حاجت نہ ہوگی۔ ہاں اگر الحق، نگاہوں سے غائب ہو جائے تو بے شک طالب کو کسی شفیع کی حاجت ہو سکتی ہے۔

(۴) عارف ہر لحظہ عجز و نیاز کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے کیونکہ ہر لحہ اسے خدا سے قریب تر کرتا رہتا ہے اور جس قدر قرب میں ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر بندے کو اپنی عاجزی اور بے چارگی کا مشاہدہ (یقین) حاصل ہوتا جاتا ہے۔ جب سالک مقام معرفت پر فائز ہوتا ہے تو وہ مخلّی عن الذات (اپنی ذات سے خالی) ہو جاتا ہے اور صرف خدا میں زندہ رہتا ہے۔ عارف کے الفاظ در اصل خدا کے الفاظ ہوتے ہیں جو اس کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ اس کا ثبوت حدیثِ قربِ نوافل سے مل سکتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب بندہ میرا قرب حاصل کر لیتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب ایسا ہوتا ہے تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں، وہ مجھ سے سنتا ہے۔ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں وہ مجھ سے دیکھتا ہے۔

(۵) اللہ اور بندے کے درمیان اخفیٰ اور اشد حجاب یہ ہے کہ سالک اللہ کے بجائے اپنے نفس اور اس کی تدابیر کو مدّ نظر رکھے۔

(۶) اللہ کی ذات میں تفکر، جہالت ہے اور اس کی طرف اشارت، شرک ہے اور معرفت کی حقیقت، حیرت ہے (اور یہ حیرت محمودہ ہے)

(۷) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص میرا مطیع ہو جائے میں اس کا دوست بن جاتا ہوں۔ پس اسے لازم ہے کہ وہ مجھ پر وثوق (اعتماد) کرے میں اس کا ہر سوال پورا کر دوں گا۔

(۸) الانس باللہ کا مطلب یہ ہے کہ سالک کے قلب میں اللہ کی معیت کی بدولت صفاء پیدا ہو جائے اور التفرد باللہ کا مفہوم یہ ہے کہ سالک اللہ کے سوا ہر شے سے منقطع ہو جائے۔

(۹) اللہ کے عاشق کی علامت یہ ہے کہ وہ اللہ کے حبیب (آنحضرت صلعم) کی اتباع کرے۔ آپؐ کے اخلاق میں، اعمال میں، امور میں اور آپؐ کی سنت میں۔

(۱۰) جو خلق سے محبت کرے گا وہ فرعون کا جانشین بن جائے گا اور جو شخص اپنے نفس سے قطع تعلق کرے گا وہ مقام اخلاص میں متمکن ہو جائے گا۔

(۱۱) الانس باللہ نور ساطع ہے اور الانس بالخلق، غم واقع ہے۔

(۱۲) عبادت کی کنجی فکر ہے، ہوی کی علامت نفسانی خواہش کی پیروی ہے اور توکل کی علامت انقطاع المطامع ہے (یعنی ان امور سے قطع نظر کرنا جن کی بدولت طمع پیدا ہوتی ہے)

(۲۲) ابوتراب نخشبیؒ م ۲۴۵ھ

ان کا پورا نام ابوتراب عسکر بن حصین النخشبی الخراسانی ہے۔ حاتم الاصم کے ہم نشین تھے۔ اور علم، فتوۃ، زہد اور ورع میں بلند مقام پر فائز تھے۔ ابوعبداللہ ابن الجلاؔ کا قول ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں چھ سو مشائخ سے ملاقات کی ہے، ابوتراب نخشبی سے بڑھ کر کسی شیخ کو نہیں پایا۔ ذیل میں ان کے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) خواطرِ قلب کی اصلاح سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے۔

(۲) اشرف القلوب وہ قلب ہے جو اللہ تعالیٰ کی فہم کے نور سے زندہ رہے۔

(۳) فقیر کی غذا وہی ہے جو اسے مل جائے اور اس کا لباس وہی ہے جس سے وہ جسم کو ڈھانک سکے اور اس کا گھر وہی ہے جہاں وہ رہے۔

(۴) عارف وہ ہے جسے کوئی شے تیرہ نہ کر سکے۔ اور وہ ہر شے کو روشن کر سکے۔

(۲۳) سری سقطیؒ م ۲۵۳ھ

ان کا نام ابوالحسن سَری ابن المغلّس السقطی ہے۔ جنید کے ماموں اور مرشد تھے۔ معروف کرخی کے ہم نشین تھے۔ وہ پہلے صوفی ہیں جنہوں نے توحید کے حقائق بیان کئے۔ جنید کا قول ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں ان سے زیادہ عابد کسی کو نہیں دیکھا۔ ستر سال تک رات کو بستر پر آرام نہیں کیا۔ صرف مرض الموت میں چارپائی پر لیٹے تھے۔ ذیل میں ان کے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) معرفت آسمان سے آتی ہے اور جس دل میں سترِ دنیا ہوتی ہے اس میں اپنا ٹھکانا بناتی ہے۔

(۲) طاقتور وہ ہے جو اپنے نفس کو مغلوب کر سکے۔

(۳) جو اپنے نفس کو ادب نہ سکھا سکے وہ دوسروں کو ادب نہیں سکھا سکتا۔

(۴) اُس فقیر کا دل روشن نہیں ہو سکتا جو خیانت کرنے والوں اور رشوت لینے والوں کے مال میں سے کھاتا ہے

(۵) دو باتیں بندے کو اللہ تعالیٰ سے دور کر دیتی ہیں (۱) فرائض سے غفلت کر کے نوافل میں مشغول ہو جانا (۲) صدق کے بغیر عمل کرنا۔

(۶) جو شخص اپنے دین کی سلامتی اور اپنے قلب کی راحت کا طالب ہو اسے انسانوں سے دور رہنا چاہیئے۔ اور عزلت اختیار کرنی چاہیئے۔

(۷) ساری دنیا فضول ہے مگر پانچ امور جائز ہیں۔ روٹی، پانی، لباس، گھر اور وہ علم جس پہ تو عمل کر سکے۔

(۸) چار باتیں انسان کے درجے کو بلند کرتی ہیں۔ علم، ادب، امانت اور عفت۔
(۹) جو شخص اللہ کی نافرمانی سے ڈرتا ہے۔ ہر شے اُس سے ڈرتی ہے۔
(۱۰) پانچ باتیں بہترین ہیں۔ گناہوں پر رونا۔ عیوب کی اصلاح کرنا۔ اللہ کی اطاعت کرنا۔ دل سے زنگ کو دور کرنا اور نفس کی مخالفت کرنا۔

(۲۴) یحییٰ ابن معاذ م ۲۵۸ھ

ان کا پورا نام ابو زکریا یحییٰ بن معاذ واعظ رازی تھا۔ اپنے زمانے میں یکتائے روزگار تھے۔ وعظ و تقریر میں لاجواب تھے۔ اسی لئے علماء نے انہیں واعظ کا لقب دیا تھا۔ مدتوں بلخ میں رہے۔ آخری عمر میں نیشاپور آئے اور یہیں ۲۵۸ھ میں وفات پائی۔ وہ پہلے صوفی ہیں جنہوں نے تصوف پر لیکچر دیئے۔ علماء انہیں بحر الحقائق کہتے تھے۔ ذیل میں ان کے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں :-

(۱) عبادت بھی ایک نوع کی سوداگری ہے۔ اس کی دکان خلوت ہے۔ اس کا راس المال اجتہاد بالسنۃ ہے اور اس کا نفع جنت ہے۔
(۲) دنیا دارِ اشغال ہے اور آخرت دارِ احوال ہے۔ اور بندہ احوال اور اشغال کے درمیان رہتا ہے جب تک اس کا ٹھکانا جنت یا دوزخ میں مقرر نہ ہو جائے۔
(۳) تمام دنیا از اوّل تا آخر، ایک ساعت کے غم کی برابر بھی نہیں ہے پس اگر تو ساری عمر اس کے غموں میں بسر کر دے تو تیرے ہاتھ کیا آئے گا؟
(۴) اولیاء کی خصلتیں تین ہیں (ا) ہر معاملے میں اللہ سے رابطہ استوار کرنا (ب) ہر معاملے میں اللہ کی طرف رجوع (ج) ہر شے سے قطع نظر کر کے اللہ ہی پر نظر رکھنا۔
(۵) جس میں تورع نہ ہو وہ زہد کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔
(۶) تو جس قدر محبت اللہ سے کرے گا، خلق اسی قدر تجھ سے محبت کرے گی اور تو جس قدر اللہ سے ڈرے گا خلق اسی قدر تجھ سے ڈرے گی اور تو جس قدر اللہ میں مشغول رہے گا خلق اسی قدر تجھ میں (تیری خدمت میں) مشغول رہے گی۔
(۷) فوت موت سے بھی زیادہ شدید ہے۔ کیونکہ فوت کا مطلب ہے اللہ سے انقطاع اور موت کا مطلب ہے خلق سے انقطاع۔
(۸) تنہائی صدیقین کی آرزو یا تمنا ہے اور ان کی وحشت، انسانوں سے اُنس کرنا ہے۔

(۹) جو شخص اللہ کی خدمت کر کے خوش ہوتا ہے، خلق اس کی خدمت کر کے خوش ہوتی ہے۔
(۱۰) زہد تین چیزوں کا نام ہے۔ قلت، خلوت اور جوع یعنی ساز و سامان زندگی کو تا حدِ امکان کم کرنا اور تنہائی اختیار کرنا اور اکثر اوقات بھوکا رہنا۔
(۱۱) جو شخص دنیا کو دیکھ کر عبرت حاصل نہیں کرتا اسے وعظ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور جو شخص دنیا کو دیکھ کر عبرت حاصل کر لیتا ہے اُسے کسی وعظ یا نصیحت کی حاجت نہیں رہتی۔

(۲۵) حضرت بایزید بسطامی م ۲۶۱ھ

ان کا نام طیفور بن عیسیٰ بن آدم بن سروشان تھا۔ ان کے پردادا یعنی سروشان پہلے گبر یعنی مجوسی تھے۔ پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ احمد خضرویہ، ابو حفص اور یحییٰ معاذ کے ہمعصر تھے۔ اکثر حالتِ سکر میں رہتے تھے۔ اسی لئے اس حالت میں ان کی زبان سے بعض ایسے کلمات نکل جاتے تھے جو خلافِ شرع ہوتے تھے۔ چنانچہ جنید نے ان کے ایسے کلمات (شطحیات) کی تاویل میں ایک رسالہ بھی لکھا تھا۔ اُن کے بعض بیش بہا اقوال یہ تھے:-
(۱) عابد اللہ تعالیٰ کی عبادت حال کے ساتھ کرتا ہے۔ لیکن عارف اللہ کی عبادت حال میں کرتا ہے یعنی عارف کی عبادت خود اس کا حال بن جاتی ہے۔
(۲) کسی نے پوچھا کہ عبادت کے لئے کس چیز سے استعانت کی جائے؟ جواب دیا کہ اگر تجھے اللہ کی معرفت حاصل ہے تو اسی سے استعانت کر۔
(۳) جو شخص اپنی خواہشات کی صحبت میں رہتا ہے وہ کبھی اپنی معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔
(۴) اے اللہ! مجھے اپنی معرفت عطا فرما کیونکہ میں اپنی کوشش سے تیری معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔
(۵) میں نے اللہ کو اللہ ہی کی عنایت سے پہچانا، اور دنیا کو اس کے نور سے پہچانا۔
(۶) عارف کی تین علامات ہوتی ہیں (ا) وہ اللہ کے ذکر میں کسی خلل کو گوارا نہیں کرتا (ب) وہ اللہ کا حق ادا کرنے سے کبھی نہیں تھکتا۔ (ج) وہ غیر اللہ سے اُنس نہیں رکھتا۔
(۷) کسی نے اُن سے پوچھا کہ آپ نے یہ معرفت کس ذریعے سے حاصل کی؟ انہوں نے جواب دیا بھوکا رہنے سے اور برہنہ (بے تعلق) رہنے سے۔
(۸) عارف کو ہر وقت یہ فکر دامنگیر رہتی ہے کہ وہ قرب کی منزلیں کیسے طے کرے؟
(۹) خوشخبری ہے اس شخص کے لئے جسے صرف ایک غم ہو اور جو کچھ وہ دیکھتا ہے اور جو کچھ وہ سنتا ہے یہ دونوں باتیں اسے اپنی طرف راغب نہیں کر سکتیں (وہ ان میں مشغول نہیں ہوتا)

(۱۰) کسی نے پوچھا کہ سنّت کیا ہے اور فریضہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ترک دنیا تو سنّت ہے۔ اور صحبتِ مولیٰ (خدا) فرض ہے۔ کیونکہ پوری سنّت، ترکِ دنیا پر دلالت کرتی ہے اور پوری کتاب اللہ صحبت مولیٰ پہ دلالت کرتی ہے پس جس نے سُنّت اور فریضہ سیکھ لیا وہ کامل ہوگیا۔

(۲۶) ابوحفص حدّاد م ۲۶۴ھ

ان کا نام عمرو بن سلمہ ہے۔ نیشاپور کے نزدیک ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ وفات میں بہت اختلاف ہے۔

طبقات الصوفیہ میں ۲۷۰ھ اور ۲۶۷ھ درج ہیں اور نفحات الانس میں ۲۶۴ھ اور ۲۶۷ھ درج ہیں۔ بعض نے ۲۷۷ھ لکھا ہے۔ میری رائے میں ۲۶۴ھ اصح ہے۔

عثمان حیری کے مرید تھے اور شاہ شجاع کرمانی کے مرشد تھے۔ اپنے عہد میں صوفیہ کے لئے نمونہ تھے۔ الحصاص شیرازی کا قول ہے کہ (۱) جنید کو حکمت دی گئی (۲) شاہ شجاع کو وجود دیا گیا (۳) ابوحفص کو اخلاقِ حسنہ کی نعمت دی گئی (۴) ابو یزید بسطامی کو ہیمان (وارفتگی) کی دولت دی گئی۔ کسی نے اُن سے فقراء کے آداب پوچھے تو انہوں نے کہا کہ وہ آداب یہ ہیں (۱) مشائخ کی عزت کرنا (۲) بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا (۳) چھوٹوں کو نصیحت کرنا (۴) تنازع کے مقابلے میں دنیاوی فوائد سے دستبردار ہو جانا (۵) ہر حال میں ایثار کرنا (۶) دولت جمع کرنے سے اجتناب کرنا (۷) جو اپنے طریقے پہ نہ ہو اس کی صحبت سے گریز کرنا (۸) مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی امور میں مدد کرنا (۹) ہر شخص کی دلجوئی اور دلداری کرنا (۱۰) آنکھ، زبان اور ہاتھ کو قابو میں رکھنا۔

ان کے بعض اقوال ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

(۱) معاصی کفر کے قاصد ہیں جیسے بخار، موت کا پیامبر ہے۔

(۲) جب سے میں نے اللہ کو پہچانا ہے میرے قلب میں حق یا باطل کچھ داخل نہیں ہوا ہے۔

(۳) بیس سال تک میں نے اپنے قلب کی نگہبانی کی۔ اس کے بعد بیس سال تک قلب نے میری نگہبانی کی۔ آخر میں وہ حالت طاری ہوئی کہ ہم دونوں کی کوئی اور ہی نگہبانی کرنے لگا۔

(۴) جس نے شوق کا پیالہ پی لیا (اللہ کا عشق اختیار کر لیا) تو وہ سراپا اضطراب بن جاتا ہے اور اسے اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک مشاہدہ نہ کرے۔

(۵) جب میں کسی عاشق کو ساکن دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں کہ اس پر غفلت کا غلبہ ہوگیا ہے۔ ورنہ

عاشق کو سکون کہاں ؟

(۶) جو اللہ سے لیتا ہے اور لوگوں کو دیتا ہے وہ (حقیقی معنی میں) مرد ہے۔ اور جو دیتا ہے مگر کسی انسان سے خود کچھ نہیں لیتا وہ نصف مرد ہے اور جو نہ لیتا ہے نہ دیتا ہے وہ ہیچ یعنی گندۂ ناتراشیدہ ہے جو اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے علاوہ میں بھی آخذ اور معطی ہوں۔

(۷) کسی نے پوچھا ولی اللہ کون ہے۔ جواب دیا وہ جس کی تائید کرامات سے کی جائے مگر اسے خبر بھی نہ ہو کہ مجھ سے کرامات سرزد ہو رہی ہیں۔

(۸) کسی نے پوچھا عاقل کون ہے ؟ جواب دیا وہ جو اپنے نفس سے اخلاص کرے۔

(۹) کسی نے عبودیت کا مفہوم پوچھا تو جواب دیا جو تمہارے پاس ہے اس سے دست بردار ہو جاؤ اور جس بات کا حکم دیا جائے اس کی تعمیل کرو۔

(۱۰) کسی نے پوچھا بدعت کیا ہے ؟ جواب دیا (۱) احکام میں زیادتی یا اضافہ کرنا (۲) سنتوں میں سستی کرنا (۳) دوسروں کے خیالات یا اپنی خواہشات کی اتباع کرنا (۴) اقتداء و اتباع رسولؐ کو ترک کر دینا۔

(۲۷) حمدون قصار م ۲۷۱ھ

ان کا نام حمدون بن احمد بن عمارہ ابو صالح القصار النیسا پوری ہے۔ یہ فرقہ ملامتیہ کے بانی تھے مذہب ملامت انہی سے جاری ہوا۔ بہت بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ فقہ میں سفیان ثوریؒ کے مقلد تھے۔ ۲۷۱ھ میں وفات پائی۔ اس جگہ مذہب ملامت کی تشریح بہت ضروری ہے۔ حمدون کہا کرتے تھے کہ مومن یا صوفی وہ ہے جو احکام الٰہی کی بجا آوری میں یا کلمۂ حق کہتے میں خلق کی ملامت و مذمت سے بالکل نہ ڈرے۔ لیکن آگے چل کر اس مسلک کا مفہوم بالکل بدل گیا۔ کیونکہ اس مسلک کے لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ ملامتی وہ ہے جو ایسے قبیح یا غیر شرعی افعال بجا لائے کہ لوگ اسے ملامت کریں اور وہ خاموش رہے تاکہ اس کا نفس ذلیل ہو کر مردہ ہو جائے[1]

---

[1] جب یہ مذہب ہندوستان پہنچا۔ اس وقت یہی مفہوم مروّج ہو چکا تھا اور جو لوگ اس مذہب میں داخل ہوتے تھے وہ چار ابرو کا صفایا کر کے بھنگ اور شراب پیتے تھے۔ اور امرد پرستی کرتے تھے۔ چنانچہ حسین لاہوری جو مادھو لعل حسین کے نام سے مشہور ہے اسی مسخ شدہ مسلک ملامتیہ کا نامور پیرو تھا۔ (مؤلف)

حمدون قصار اس قدر پابند شرع تھے کہ جب ان کے ہم نشین بغداد گئے اور ان کے حالات جنید رح کو سنائے تو انہوں نے کہا کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو حمدون نبی ہوتے۔

(۱) لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ سلف کا کلام ہمارے کلام سے زیادہ نفع بخش ہوتا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ حضرات اسلام کی عزت اور نفوس کی نجات اور اللہ کو خوش کرنے کی نیت سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ لیکن ہم اپنے نفس کی عزت اور طلب دنیا اور خلق میں قبول عام حاصل کرنے کی نیت سے گفتگو کرتے ہیں۔

(۲) جس قدر دنیا کی محبت بڑھتی جائے گی بھائیوں میں محبت گھٹتی جائے گی۔

(۳) جس نے یہ کہا کہ میرا نفس فرعون کے نفس سے بہتر ہے اس نے تکبر کیا۔

(۴) جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ نیشاپور کے سلطان کو اشرار کی شناخت کا ملکہ حاصل ہے اس وقت سے سلطان کا خوف میرے دل سے نہیں نکلا ہے۔

(۵) کسی مخلوق کا اپنی جیسی دوسری مخلوق سے مدد مانگنا ایسا ہی ہے جیسے ایک قیدی دوسرے قیدی سے مدد طلب کرے (ظاہر ہے کہ قیدی خود محتاج ہے وہ کسی کی کیا مدد کر سکتا ہے)

(۶) یہ بھی عبد کی غفلت میں سے ہے کہ وہ امر رب کو پس پشت ڈال کر اصلاح نفس میں مشغول ہو جائے۔

(۷) بسا اوقات کیاست (دانائی) سے انسان میں عجب پیدا ہو جاتا ہے۔

(۸) دنیا کو اس قدر حقیر سمجھ کہ اس کے اہل اور اس کے مالک دونوں تیری نظروں میں ذلیل ہو جائیں۔

(۹) فقیر کا جمال تواضع میں ہے۔

(۱۰) جس شخص میں تجھے خیر (بھلائی) نظر آئے اس سے کبھی مفارقت اختیار نہ کرنا کیونکہ اس سے تجھے خیر کی برکات ضرور حاصل ہوں گی۔

(۲۸) ابو عبداللہ المغربی م ۲۷۹ھ

ان کا نام ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل المغربی ہے۔ علی رزین ہروی کے شاگرد اور ابراہیم خواص کے استاد تھے۔ ان کے بعض اقوال ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) جو فقیر مجرد من الدنیا ہو جائے وہ اُن عابدوں سے افضل ہے جو دنیا دار ہیں۔

(۲) میں نے دنیا سے زیادہ منصف کسی کو نہیں دیکھا۔ اگر تو اس کی خدمت کرے گا تو وہ بھی تیری خدمت کرے گی اور اگر تو اسے ترک کر دے گا تو وہ بھی تجھے ترک کر دے گی۔

(۳) اپنے اوقات کو موافقات (مطابق شرع امور) سے معمور کرنا بہترین عمل ہے۔

(۴) عزت کے اعتبار سے اعظم الناس وہ غنی ہے جو فقیر کے سامنے تذلل اختیار کرے۔

(۵) جو عبودیت کا دعویٰ کرے اور اس میں اس کی کوئی مراد بھی باقی رہے تو وہ اپنے دعوے میں کاذب ہے۔ عبودیت اس وقت صحیح ہوتی ہے جب تمام مرادیں فنا ہو جائیں اور صرف آقا کی مراد باقی رہ جائے۔

(۲۹) حکیم ترمذی م ۲۸۰ھ

ان کا نام ابو عبد اللہ محمد بن علی الحکیم الترمذی ہے۔ صاحب کشف المحجوب نے ان کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا ہے جس سے ان کے علوِ مرتبت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

"وہ بہت سی بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ مثلاً ختم الولایۃ، کتاب النہج، نوادر الاصول، کتاب التوحید اور کتاب عذاب القبر۔ میری نگاہ میں وہ سخت معظم ہیں۔ میرا دل ان کا شکار ہے۔ میرے شیخ کا قول ہے کہ محمد دُرِّ یتیم ہے۔ اس عالم میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھنی بھی شروع کی تھی مگر وہ نا تمام رہ گئی"۔

ان کی تصانیف میں سے حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں :-

۱: نوادر الاصول ۲: کتاب الریاضت و ادب النفس۔ ۳: بیان الفرق بین الصدر والقلب والفؤاد واللُب ۴: ختم الولایۃ ۵: حقیقۃ الادمیۃ۔

پروفیسر آربری نے لکھا ہے کہ وہ تصوّف کی نفسیات کے ماہر تھے۔ ان کے بعض اقوال ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

(۱) جو شخص اوصاف عبودیت سے آگاہ نہیں ہے وہ اوصاف ربوبیت سے کبھی آگاہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی جسے اپنی معرفت حاصل نہیں اسے خدا کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۲) یقین، اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے قول اور اس کے امر پر قلب کے استقرار کا نام ہے۔ اور شکر، منعم حقیقی کے ساتھ قلب کے تعلق کا نام ہے۔

(۳) انسان کی فوز و فلاح کثرتِ اعمال پر موقوف نہیں ہے بلکہ عمل میں اخلاص پر موقوف ہے۔

(۴) انسان کے عیب کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ اس بات سے خوش ہو جو مضر ہے۔

(۵) عاقل وہ ہے جو اپنے رب کی نافرمانی سے ڈرے اور ہر وقت اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے۔

(۶) بچوں کی اصلاح کی جگہ مکتب ہے۔ رہزنوں کی اصلاح کی جگہ قید خانہ ہے۔ عورتوں کی اصلاح کی جگہ گھر ہے۔ جوانوں کی اصلاح کی جگہ علم ہے اور بوڑھوں کی اصلاح کی جگہ مسجد ہے۔

(۷) اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو رزق کی ضمانت دے دی ہے اور ان پر توکل فرض کر دیا ہے۔

(۸) اللہ کی محبت کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اس کی یاد کے ذریعے سے ہمیشہ اُس کے اُنس کو دل میں قائم رکھے۔

(۹) مومن کی خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کا حزن اس کے دل میں پوشیدہ ہوتا ہے جبکہ منافق کا حزن اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا ہے اور خوشی اس کے قلب میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنے نفاق پر دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے۔

(۱۰) دنیا بادشاہوں کی دلہن ہے اور زہاد کا آئیڈیل ہے۔ بادشاہ اس کے حسن پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور زہاد اس کی آفات کو دیکھ کر اس سے متنفر ہو جاتے ہیں۔

(۱۱) قلب کی زینت، کمالِ خشیت پر موقوف ہے اور نفوس کی زینت، کمالِ تقویٰ پر موقوف ہے۔

(۱۲) مراقبہ اس کا کر جو تیری نظر سے غائب نہ ہو سکے اور شکر اس کا ادا کر جس کی نعمت منقطع نہ ہو سکے: اور خضوع اس کے سامنے کر جس کے ملک سے تو باہر نہ نکل سکے۔

(۳۰) سہل بن عبداللہ التستری م ۲۸۳ھ

ان کا نام سہل بن عبداللہ بن یونس تھا۔ ذوالنون مصری کے شاگرد تھے۔ ان کے ماموں محمد بن سوارؒ نے ان کی روحانی تربیت کی۔ ذیل میں ان کے چند اقوال درج کئے جاتے ہیں:۔

(۱) کسی نے پوچھا بدبختی کی علامت کیا ہے؟ جواب دیا کہ علم تو ہو مگر عمل کی توفیق نہ ملے یا عمل ہو مگر اخلاص نہ ہو۔

(۲) جب تک تو فقر سے ڈرتا رہے گا اس وقت تک منافق رہے گا۔

(۳) تصوف کی ابتدا وہ علم ہے جو عقل میں نہیں سما سکتا اور اس کی انتہا وہ علم ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

(۴) قرآن حکیم کی اس آیت (وَاجْعَلْ لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا) کا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ مجھے ایسی زبان عطا فرما جو صرف تیرا یا تیرے متعلق ذکر کرے۔ غیر اللہ کا ذکر نہ کرے۔

(۵) جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ اسے یہ فکر لاحق ہو کہ آج کیا کھاؤں گا اس کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

(۶) ادب کا ادنیٰ مقام یہ ہے کہ انسان جہل سے دور رہے اور اس کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ انسان شبہات سے دور رہے۔

(۷) علم کا شکر عمل ہے اور عمل کا شکر زیادۃ فی العلم ہے۔

(۸) تین چیزیں صوفی کے لئے ناگزیر ہیں (ا) اپنے راز کی حفاظت (ب) اپنے فقر کی نگہبانی (ج) اپنے فرض کی ادائیگی۔

(۹) اللہ قبلۂ نیت ہے اور نیت قبلۂ قلب ہے اور قلب قبلۂ بدن ہے اور بدن قبلۂ اعضاء ہے اور اعضا

قبلۂ دنیا ہیں۔

(۱۰) جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ غیبت سے محفوظ رہے اسے ظنون (بدگمانیوں) سے اجتناب لازمی ہے۔ جو شخص بدگمانی سے محفوظ رہا وہ تجسس سے محفوظ رہا اور جو تجسس سے محفوظ رہا وہ غیبت سے محفوظ رہا اور جو غیبت سے محفوظ رہا وہ بہتان سے محفوظ رہا۔

(۱۱) تدبیر اور اختیار دونوں کو چھوڑ دو کیونکہ زندگی انہی دونوں کی وجہ سے مکدر ہو جاتی ہے (تسلیم و رضا ہی میں عافیت ہے)

(۱۲) جب تک اپنے نفس کو بھوک، صبر اور مجاہدے کی چھری سے ذبح نہ کرو گے نجات حاصل نہیں کر سکتے۔

(۱۳) نیکی کے کام تو نکوکار اور بدکار دونوں کر سکتے ہیں لیکن گناہوں سے اجتناب صرف صدیق ہی کر سکتا ہے۔

(۱۴) تصوف کے اصولِ ہفت گانہ یہ ہیں (۱) التمسک بکتاب اللہ (۲) اقتداء بسنۃ رسول اللہؐ (۳) اکل حلال (۴) ایذا رسانی سے باز رہنا (۵) گناہوں سے اجتناب کرنا (۶) توبہ (۷) اداء الحقوق فقط

ہم سے طلب فرمائیں

انوارِ مجددی

یعنی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے چیدہ چیدہ مکتوبات، سلیس اور شگفتہ ترجمہ مع تعارف مکتوب الیہم و حواشیٔ مفیدہ

از پروفیسر:- یوسف سلیم چشتی

سائز ۲۰/۳۰ ۱۶ صفحات ۳۸۴ مجلد مع ڈسٹ کور

(قیمت چار روپے و محصول ڈاک اس کے علاوہ)

دارالاشاعت الاسلامیہ کوثر روڈ، اسلام پورہ (سابق کرشن نگر) لاہور

علوم قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبرِ قرآن

جلد اول ـــــ مشتمل بر

مقدمہ و تفاسیر آیۂ بسم اللہ، سورہ فاتحہ ، سورۂ بقرۂ و سورہ آل عـ

سائز ۲۹ x ۲۲ ، صفحات ۸۸۰

۸

آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت

چرمی پشتہ کی مضبوط و پائدار جلد کے ساتھ

ہدیہ ۳۰ روپے

(محصول ڈاک : دو روپے تیس پیسے)

(بتیس روپے تیس پیسے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا وی پی پی طلب کریں)

(نمونہ کے صفحات مفت طلب فرمائیں)

اس کے علاوہ **تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ**

علیحدہ مطبوعہ بھی موجود ہے بذریعہ ڈاک طلب فرمانے کے لئے ۸۵ پیسے کے ٹکٹ ارسال فرمائیں ۔

بڑا سائز ۔ صفحات ۳۶ ۔ ہدیہ ۷۵ پیسے

دارالاشاعت الاسلامیہ

کوثر روڈ ، اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور ۔ 1 فون نمبر 69522

سول ایجنٹ برائے بھارت : کتب خانہ الفرقان ، کچہری روڈ ، لکھنؤ

Regd L. No. 7360

Monthly "MEESAQ" Lahore

Vol. 16 | JANUARY 1969 | No. 1

ہم سے طلب فرمائیں

★ تفاسیر فراہی رح — ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی — قیمت
مکمل سیٹ — مطبوعہ دائرہ حمیدیہ، اعظم گڑھ — ۱۳٫۷۵

★ معارف الحدیث — احادیث نبوی صلعم کا ایک جدید
چارحصص — انتخاب مع اردو ترجمہ و تشریح
از قلم مولانا محمد منظور نعمانی — ۲۵٫۰۰

★ حقیقت خلافت و ملوکیت — سید ابوالاعلیٰ مودودی کی — قسم اعلیٰ
تالیف ، خلافت و ملوکیت ،
کا مسکت جواب از قلم — قسم
علامہ محمود احمد عباسی — ۶٫۷۵

★ تحریک جماعت اسلامی — جماعت اسلامی کے ماضی و حال
ایک تحقیقی مطالعہ — کا تجزیہ
از قلم ڈاکٹر اسرار احمد — ۳٫۰۰

★ اسلام کی نشاۃ ثانیہ
کرنے کا اصل کام — ،، — ،، — ۱٫۰۰

★ مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق — ،، — ،، (زیر طبع) ۔

★

دارالاشاعت الاسلامیہ

کوثر روڈ ، اسلام پورہ لاہور نمبر 1 (فون : 69522)

پبلشر : محی الدین — طابع : محمد طفیل ۔ مالک نقوش پریس ۔ اردو بازار ، لاہور